ٹوٹتی سرحدیں
افسانوی
مجموعہ
مہرافروز

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

مہر افروز

اشاعت کار

تریاق انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن، ممبئی

اِسم کتاب : ٹوٹتی سرحدیں (افسانوی مجموعہ)

مصنف : مہرافروز

کمپوزنگ : بی بی بتول اشرفی

تدوین : احمد علی کیف

تزئین، ترتیب : شیخ چاند صاحب ادھونی

طباعت : اشرفی پرنٹس، کیشواپور، ہبلی موبائل:9686127862

اشاعت : جنوری 2021ء

صفحات : 144 ڈیمی 8 / 1 ۔ مستعمل کاغذ: 70 جی ۔ایس ۔یم ۔ین ۔ایس ،میپ لیتھو

بارِاول اشاعت : 500

قیمت : -/200 ہندوستانی روپیہ

اشاعت کار : تریاق انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن ممبئی ۔

ملنے کا پتہ:

ممبئی : تریاق انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن ممبئی ۔12/8 ایم ۔کے ہائٹس ۔

روبرویل وارڈ سی ۔یس ۔ٹی روڈ کرلا ویسٹ ممبئی ۔400070.

فون : 9004000252 / 9867861713 / 9594919597

دھارواڑ : مہرافروز ”الرحمٰن“ تھرڈ فیز کے ۔ایچ ۔بی کالونی،

ڈ ۔ین ۔کوپ، دھارواڑ ۔580008 کرناٹک انڈیا ۔

ای ۔میل : Kathiawari.afroza@gmail.com

فون : 9008953881

Name of the Book : **Toot Ti Sarhaden (Afsanavi Majmua)**
Writer : **Mehar Afroz**
Composing : **Bibi Batul Ashrafi**
Editing : Ahmed Ali Kaif.
Caver Design : Shaikh Chandsab Adhoni
Printed by : **Ashrafi Prints,** Keshawapur, Hubli-23.
Mobile: 9686127862
Printed Date : January 2021
Copies : **500**
Pages : 144. Size: 1/8 Demi.
Used Paper : 70 gsm. N.S.Maplitho.
Caver:300 gsm+Matt lamination, Glow Binding
Price : **Rs. 200/-INR**
Publisher : Taryaq International Urdu Foundation, **Mumbai.**

Distributor :
Mumbai : Taryaq International Urdu Foundation Mumbai
12/8 M.K. Highiets, Opp. L-Ward, C.S.T.Road,
Kurla (W) **Mumbai - 400070. India**
Phone No. : **9004000252/9867861713/9594919597**
Dharwad : Mehar Afroz
"Ar-Rehaman" 3rd Phase, K. H. B Colony,
D.N.Koppa, **Dharwad-580008.** Karnataka. India.
Mobile : 9008953881

فہرست

انتساب

اپنے روحانی والد کے نام
جنکی دعاؤں سے میرا قلم رواں ہے

ڈاکٹر مقصود حسنیؒ

پیش لفظ

One glance at a book and you hear the voice of another person, perhaps someone dead for 1,000 years. To read is to voyage through time.

Carl Sagan

ترجمہ"

جب آپ کسی کتاب پر نظر ڈالتے ہیں تو دوسرے شخص کی آواز سنتے ہیں جو شاید ہزار سال پہلے فوت ہو چکا ہو۔ مطالعہ وقت میں سفر کرنا ہوتا ہے۔"

کارل ساگان

ارجنٹینی ادیب و شاعر خورخے لوئیس بورخیس پچپن برس کی عمر میں نابینا ہو گیا۔ اس کا قول بڑا مشہور ہے: " میں نے ہمیشہ یہ تصور کیا ہے کہ جنت ایک طرح کی لائبیرری ہوگی" اور یہ جملہ اس نے تب کہا جب وہ ارجنٹینا کے کتب خانہ کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ وہ سال 1955 ہی تھا، جب بورخیس نے اپنی ایک آنکھ کی بینائی مکمل طور پر کھو دی اور دوسری آنکھ بھی تین چوتھائی اندھی ہو چکی تھی۔ آگے وہ کہتا ہے" میں اب وہاں تھا جہاں مختلف زبانوں میں لکھی گئی لگ بھگ نو لاکھ کتابیں موجود تھیں لیکن میں ان میں سے کسی ایک کا سرورق یا پشتہ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا" (قیصر نذیر خاور کے ایک مضمون سے اقتباس) جو پڑھنا چاہتے ہیں، آنکھیں کھو دیتے ہیں اور جو پڑھنا نہیں چاہتے، وہ اپنے آباء و اجداد کی کتابیں ردی میں بیچ دیتے ہیں۔ مگر یہ سچ ہے آدمی کی آوازیں، روزِ ازل سے روزِ ابد تک کائنات میں گونجتی رہیں گی۔ آدمی کے احساسات جو اس نے قلمبند کیئے، دراصل عام آدمی کی کہانی ہیں، جو اپنی تاریخ سے ہٹ کر ہیں، ہم ایک نئی کہانی سناتے رہیں گے، جس سے نئی سوچ ارتقاء پاتی رہے گی۔ سوچ کا ارتقاء انسانی فکر و تہذیب کا ارتقاء ہے۔ جو ہمیں حقیقت سے قریب اور فریب سے دور لے جاتا ہے۔

لکھنا ایک قدرتی عمل ہے جو ہر ادیب کی اس پیاس کو ظاہر کرتا ہے ۔جسے وہ قلمبند کرنا چاہتا ہے ۔میں اسی لئے لکھتی ہوں، کہ اپنی سوچ دوسروں تک پہنچا سکوں ۔بہت لکھا ہے، کچھ آپ تک پہنچانے کی سعی کر رہی ہوں ۔اس سعی میں ساتھ دینے والوں کی عمیق دل سے سپاس گزار ہوں ۔

قارئین! میری سوچیں آپ کے ہاتھوں میں ہیں، ان کے لئے قبولیت کی سند درکار نہیں بس تسلیم کا حرف کافی ہوگا۔ٹوٹتی سرحدوں سے گزرنے کے بعد فاصلوں اور ہجرتوں کا قصہ ایک جانب، احساسات کا ردعمل کیا رہا، آپ مجھ تک پہنچا سکتے ہیں ۔

مہر افروز
"الرحمٰن" تھرڈ فیز کے ایچ بی کالونی
ڈی این کوپ دھارواڑ580008 کرناٹک، انڈیا۔
Kathiawari.afroza@gmail.com

مہر افروز کثیر الجہات شخصیت کی مالک ہیں۔ایک پروفیسر ہونے کے علاوہ وہ اعلیٰ سماجی کارکن ہیں جو اپنے اثر ورسوخ اور ارتساء وارتباط کے لئے جانی جاتی ہیں۔شعر وسخن ہو یا افسانہ نویسی وہ ایک مقام رکھتی ہیں۔اس وقت ان کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ میرے ہاتھ کیا لگا کہ میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا اور دوسرے ہی دن فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی یاداشت کو ٹٹولا اور یہ تاثرات بھی لکھ ڈالے۔

کٹی پتنگ انشائیہ انداز میں لکھا گیا بہت اچھا افسانہ ہے۔کٹی پتنگ بے راہروی کی شکار عورت کا عمدہ استعارہ ہے۔ڈور سے مراد مقدس رشتہ ہے۔ پتنگ کا اپنی ڈور سے کٹنے کا عمل بظاہر آزادی پر متحمل کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ باور کرایا ہے کہ یہ آزادی خام خیالی ہے۔دراصل یہ وطیرہ بے راہروی اور گمرہی کی طرف لے جاتا ہے اور ایسی عورت کا تقدس پامال ہو جاتا ہے۔ یہاں چھتنار پیڑ جو معاشرہ کا استعارہ ہے وہ معاشرہ بھی ایسی عورت کو زیادہ دیر تک تحفظ نہیں دے سکتا۔اس مختصر افسانہ کو پڑھتے ہوئے انشائیہ کا لطف آتا ہے اور مستعمل استعارے جو Impressions مرتب کرتے ہیں ان کی اثر آفرینی اور جاذبیت کے بیان کے لئے لفظ تھوڑے پڑ رہے ہیں۔کٹی پتنگ عام سی اصطلاح ہے لیکن افسانہ نویس نے اس کے معانی مترشح کر کے نسوانی زندگی کے باریک پہلوؤں اور اس سے جڑی مشکلوں کو نفاست سے اجاگر کیا ہے۔

اسی قبیل کا ایک اور افسانہ بعنوان" استاد" زیر نظر کتاب کی زینت بنا ہے جس کا ماخذ کنڑی کتھا بتایا گیا ہے میرے نزدیک افسانہ کی کامیابی کا دار مدار صرف Treatment اور اسٹائل پر موقوف ہے۔فن پارہ تیرِ شستہ سا ہونا چاہئے اور آرٹ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ ہوتے ہوئے بھی اس پر اصل کا شائبہ ہو، بلکہ ہزار حقیقت اس پر نثار ہو۔ یہاں مہر افروز نے اس کہانی میں استاد کی اہمیت پر انی کتھا کو مؤثر انداز میں اردو قالب میں ڈھال کر دائمی حیات بخشی ہے۔

مہر افروز کے بعض افسانوں میں عورت کا کرب،علاقائی ویژگی اور عصری مسائل کو مہارت سے

گونتھا گیا ہے ۔ان کی تخیّلی کائنات میں زمینی بو اور باس رچی اور بسی ہوئی ہے ۔افسانوں میں زبان و بیان کے معیار کو برقرار رکھا ہے ۔ یہ بات خوش آیند ہے ۔اور آخر میں ان کے ایک نہایت خوبصورت افسانہ ”طلسماتی ٹوپیاں“ پر بات نہ کی جائے تو ناانصافی ہوگی ۔اس مختصر سے افسانہ میں ایک لڑکی جو” بیسک اسکول آف بزنس مینجمنٹ اسٹڈیز آف اور سیز“ کی طالبہ ہے، بنیادی کردار ہے ۔افسانہ نویس نے بڑی مہارت سے تحریر کو قصص الخیال بنا دیا ہے ۔انکل سام دنیا کی سب سے بڑی سپر پاور کی علامت ہے جس نے ہمنواؤں سے مل کر اپنے مفاد کے لئے دوسری دنیا کے ممالک کو باہمی تنازعوں میں الجھا رکھا ہے ۔ان سفید فام ترقی یافتہ اقوام کا ایجنڈا مشترک اور رہم زیستی ہے ۔باقی ممالک ان کے اصلی چہروں کو دیکھنے سے قاصر ہیں ۔ انکل سام اور اس کے ہمنواؤں نے باقی ممالک کو طلسم ہوشربا کے جادو کے زیر اثر کر رکھا ہے ۔سبز وردی اسلامی ممالک اور گیروی ملک ہند کی رعایت و مناسبت سے برتا گیا ہے ۔افسانہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بڑی طاقتیں اپنے مفاد کے چکر میں ہم نوا اور متفق ہیں ۔وہ ایک ہی وردی پہنے ہوئے ہیں ۔دوسری مختلف اور ترقی یافتہ قوموں کی وردیاں جدا گانہ ہیں ۔ان کے سروں پر طلسماتی ٹوپیاں رکھی ہیں ۔الغرض معاشی گراوٹ اور کساد بازاری کے حوالے سے نہایت خوبصورت تحریر ہے ۔

علاوہ ازیں مہر افروز نے ٹوٹتی سرحدوں کی بات کی ہے، مکافات عمل اور پھر منٹو کے تتبع میں ”سکوبائی“ کے ایثار و شہامت کا طُرفہ کردار تخلیق کیا ہے ۔میں مہر افروز کو ان کے اس خوبصورت افسانوی مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔خدا کرے کہ آیندہ بھی ان کے قلم سے جواہر پارے جھڑتے رہیں، سطر در سطر ان کی تحریریں موتی لڑیوں کی طرح جگمگاتی رہیں اور فکر و دانش کی روشنی سے ہمارے ملک اور معاشرے کے تیرہ و تار کونوں اور کھدروں کو منور کرتی رہیں خدا کرے ۔

عبد الغنی جاگل (غنی غیور)

ادھوری عورت، کٹی پتنگ، اور طلسماتی ٹوپیاں

مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ محترمہ مہر افروز نے کیوں اور کب لکھنا شروع کیا، وہ کیا حالات تھے جن میں انھوں نے اپنے اندر کا درد، پدری معاشرے میں عورت کی ادنیٰ حیثیت، اپنا مشاہدہ اور اپنے عصری زمانے کے واقعات کو قلم کی زبان دی۔ یہ بھی میرے علم میں نہیں کہ وہ کیونکر ادائیگی انداز سے لکھتی ہیں، جبکہ بظاہر وہ ادائیگی نہیں ہیں۔

میرا ان سے تعلق فیس بُک کے ادبی فورمز پر قائم ہوا اور میں نے ان کے کچھ افسانے وہیں پڑھے۔ ان افسانوں کو پڑھ کر مجھے لگا کہ یہ محترمہ ذرا کڑوی زبان میں لکھتی ہیں، کچھ ایسا کڑوا جو ہم مردوں کو تو بالکل نہیں بھاتا اور جسے اُردو داں 'چپڑ چپڑ بولنا' کہتے ہیں۔ مجھے البتہ ان کا یوں لکھنا خاصا بھایا۔ مجھے بسا اوقات حیرت ہوتی کہ وہ بھلا طوائفوں کے بارے میں کیسے لکھ سکتی ہیں، کیا وہ کبھی ان سے گھل مل کر بیٹھیں؟ وہ سرحدوں کی توڑ پھوڑ کو اپنے افسانوں میں کیسے پیش کر سکتی ہیں؟ ان کی عورتیں ادھوری کیوں ہیں؟ وہ کٹی ہوئی پتنگوں کی مانند کیوں ڈولتی ہیں؟ ان کے بیشتر کردار روایات سے باغی کیوں ہیں؟ وہ اپنی معاشرتی روایات پر قانع کیوں نہیں ہیں؟ وہ کیوں نہیں یہ تسلیم کرتے کہ وہ ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں ان کی حیثیت وہ نہیں جو اس ملک کی اکثریتی آبادی کی ہے۔

بعد ازاں جب انھوں نے خرمن۔ ۳ نکالا تو اس کے لئے میرا ایک افسانہ 'پلیٹ فارم نمبر۔ ۲' بھی اس میں شائع ہوا۔ اور پھر انہی کے توسط سے میرے کئی مضامین، افسانے اور ایک دو نظمیں بھی ہندوستان میں شائع ہوئیں۔ یوں یہ تعلق فیس بُک کے ادبی فورمز سے نکل کر پہلے اِن بکس اور پھر فون پر بات چیت تک پہنچا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ جو کڑواہٹ ادبی تحریروں میں ہے وہ ان کی شخصیت اور زبان میں نہیں۔

اب میں اس کتاب کی طرف لوٹتا ہوں جو اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ بننے جا رہی ہے۔ میری عادت ہے کہ میں افسانوں کی کتاب ہمیشہ الٹی طرف سے پڑھنا شروع کرتا ہوں، چنانچہ اس مسودے کو بھی میں اسی انداز سے دیکھ رہا ہوں۔

طلسماتی ٹوپیاں: اس کتاب میں موجود یہ ایسی تحریر ہے جو مجھے اپنی جوانی کے اس زمانے میں لے گئی

جب ہم امریکی سامراج کی مخالفت میں نعرے لگایا کرتے تھے اور منٹو کے انکل سام کے نام لکھے خطوط کا وِرد کیا کرتے تھے۔ میری یونیورسٹی (پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں دو شعبے ایسے تھے جو امریکہ نے براہ راست امداد دے کر قائم کروائے تھے؛ ایک تھا 'آئی ای آر (Institute of Educational Research) جبکہ دوسرا تھا 'شعبہ انتظامیات' (Institute of Public Administration)۔ ان میں اکثر ویسے ہی سیمینار ہوا کرتے تھے جیسا اس افسانے میں بھی ہے، گو یہ ادبی تو نہ ہوتے بلکہ ان کے موضوعات تعلیمی تحقیق یا انتظامی امور کے حوالے سے متعین ہوتے۔ لیکن ان کا ماحول بعینہ ویسا ہوتا جیسا اس افسانے میں ایک خواب کی صورت میں دکھایا گیا ہے۔ جو تختی افسانے کے 'protagonist' کے ہاتھ آتی ہے، وہ ہمارے ہاتھ تب آئی تھی جب میں ابھی طالب علم تھا۔

تعمیرِ نو: یہ افسانہ، گو، ہندستان میں مسلمانوں کی حالت پر لکھا گیا ہے لیکن مجھے یہ اپنے ملک کی کہانی بھی لگی جہاں مسیحی کچھ ایسے ہی حالات کا شکار رہیں؛ مجھے وہ وقت یاد ہے جب ماڈل ٹاؤن، جہاں ایک سابقہ وزیر اعظم کے گھرانے کی کوٹھیوں کے پاس ایک مسیحی آبادی کو تاراج کیا گیا اور انھیں ایک دور دراز قطعہ اراضی پر پھر سے بسنے کے لئے دھکیلا گیا تھا، تو انھوں نے بھی اسے یونہی آباد کیا تھا، جیسے اس افسانے میں پہاڑ آباد ہوتا ہے۔

اور زندگی چل پڑی: یہ افسانہ پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے ''گاؤ ماتا کی رکھشا کرو، دان دو اور پُونیہ کماؤ'' کی آواز مجھے باز و والی سڑک کے امام باڑے کے باہر سے آ رہی ہو، جہاں کالے رنگ کا ایک گھوڑا بندھا ہوتا ہے، جس پر کالی ہی چادر ڈَلی ہوتی ہے اور اس کے پاس کالے کرتے اور سفید شلوار میں ایک بندہ بیٹھا ہوتا ہے جس کے پاس ایک کاسہ پڑا ہوتا ہے۔ رہگیروں میں سے فقہ جعفریہ کے ماننے والے زیادہ اور امام حسینؑ سے عقیدت رکھنے والے دیگر مسلکوں سے تعلق رکھنے والے کم کم اس کاسے میں دس روپے یا حسب توفیق کچھ نہ کچھ ڈالتے جاتے ہیں۔ ویسے یہ ایک ایسا افسانہ غریب پڑھے لکھے مدراسی تو کیا کسی بھی کمتر نسل کے انسان کی کہانی بھی ہے جو پڑھا لکھا ہے، چالاک ہے، سمجھدار ہے لیکن اسے نوکری نہیں مل پاتی تو وہ مذہب اور توہم پرستی کے نام پر ہی روزی روٹی کمانے لگتا ہے۔ پیٹ

کی بھوک تو انسان سے، اس سے بھی زیادہ گھناؤنے کام کروالیتی ہے، مذہب بیچنا تو معمولی بات ہے۔ اور جب زندگی رکتی ہے تو انسان ماں (دھرتی) کو بھی بلّی چڑھا دیتا ہے اور جب اس سے بھی کام نہ چلے تو اس کی زبان (ماں بولی) کو بھی کاٹنے سے نہیں چوکتا۔ ایسے نام نہاد زبان دان اپنی زبان تو نہیں کاٹتے، ماں کی ہی زبان کٹواتے ہیں۔ ایسوں کی ہمارے ہاں بھی کمی نہیں ہے۔

بی مائی ویلنٹائن: ہر اس لڑکی کی کہانی ہے جو سادہ دل ہے، معصوم ہے، نادان ہے اور مرد کے بہکاوے میں آجاتی ہے۔ ایسی لڑکیوں کا تعلق معاشرے کی کسی مخصوص پرت سے نہیں۔

سپنوں کا قاتل: یہ کون ہوتا ہے، سیکولر ریاست یا پھر معاشرے کے پردھان؟ بستی میں دو طرح کی تقسیم کچھ ایسی ہی ہے جیسی ہمارے ہاں مسلمانوں اور مسیحی لوگوں کے محلوں کی یا سندھ میں اکثریتی آبادی کے مقابلے میں ہندوؤں کی پر ہمارے ہاں تو سیکولر ریاست ہے ہی نہیں۔ ہندوستان میں تو ہے پھر ایسا کیوں؟ یہ افسانہ اس پر ایک ایسا سوال کرتا ہے جس کا جواب شاید سیکولر کا لفظ بنانے والے کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ اور پھر ڈاکٹر سبھاش کلکرنی جیسے بندے کا ایک مخصوص انداز میں مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں کے ساتھ نسل کُشی جیسا سلوک کرنا اور بھی بہت سے سوال کھڑے کر دیتا ہے۔

بے چہرہ: کیا کوئی بچہ بے چہرہ ہو سکتا ہے۔ کیا اسے جائز یا ناجائز قرار دینے کا حق کسی اور کو ہے؟ یہ وہ سوال ہے جو اب مہذب معاشروں میں نہیں اُٹھتا لیکن ہمارے جیسے معاشروں میں یہ سانپ کی طرح کہیں نہ کہیں رینگتا رہتا ہے۔ ایک بار میں نے، اسے گووند نہلانی کی فلم 'پارٹی' میں رینگتے دیکھا تھا، سوہنا جو ایک ایسے ہی بے چہرہ بچے کو جنم دے رہی ہے لیکن اس پر نازاں ہے۔ اس تحریر کو پڑھ کر مجھے سوہنا ہی یاد آئی۔

بلی: ایک ایسا افسانہ ہے جس میں عورت تو زرخیز ہے لیکن بیج ڈالنے والے کے پاس بیج ہی نہ ہوں تو مائیں یا بڑی بوڑھیاں اڑوس پڑوس سے کوئی نہ کوئی بلی والا شانو تلاش کر ہی لیتی ہیں۔ ایسا ہوتے میں نے اپنے اِرد گرد بھی دیکھا ہے۔

جھوٹا سچ: ایک ایسے تذبذب کی کہانی ہے جس میں ہندوستان کے بسنے والے مسلمان شکار ہیں، خالص برصغیری مذہبی مسلم شعار اور اس کے برعکس اس سے چھٹکارا۔ یہ افسانہ، شاید نسیم

سوانحی افسانہ، پڑھتے وقت مجھے شبانہ اعظمی یاد آئیں جنھوں نے اپنے والد کے جنازے کو کندھا دیا تھا اور تب بھی اس پر بہت لے دے ہوئی تھی۔

پھالگنی: سچے جذبوں اور کچے خوابوں کی ایک ایسی کہانی ہے جس کی گونج میں سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں اور اس جیسی کئی لوک داستانوں میں سنتا ہوں جہاں خواب پکے نہیں ہوتے اور جذبے تو جھوٹے ہو ہی نہیں سکتے۔

مکھوٹے: یہ مختصر ضرور ہے لیکن اس افسانچے میں ایک ایسی ورکنگ وومن کا وہ سارا درد چھپا ہے جو ہر طرح کی ڈیوٹی دینے پر تیار ہے لیکن اس کا خاوند اسے وہ توجہ اور پیار نہیں دیتا جو اس کی روح کو کھلا دے۔ میرے اور اِرد گرد کے دیگر دفاتر میں ایسی بہت سی خواتین کام کرتی ہیں جن کے چہروں پر مکھوٹے سجے ہوتے ہیں، مسکراہٹ بھرے، متانت کا تاثر لئے لیکن ان کے اندر کتنی تشنگی موجود ہوتی ہے وہ یا تو ان وقفوں میں باہر نکلتی ہے جب وہ 'ڈیوٹی' پر نہیں ہوتیں یا پھر اس وقت جب وہ پبلک ٹرانسپورٹ کے ہجوم میں گم ہوتی ہیں۔

پل صراط: مذہبی طور پر دیکھا جائے یا اُن لوگوں کے نظریے سے جو جزا و سزا کو اسی دنیا میں ملنے کو مانتے ہیں، ہر دو طرح سے یہ افسانہ اسی بات پر پورا اترتا ہے کہ اپنے کئے کا عکس بڑھاپے یا موت سے کچھ پہلے ہی آئینہ بن کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، البتہ یہ تشنگی باقی رہتی ہے کہ اس بہو کا انجام کیا ہو گا جس نے اپنے سسر، ایک بوڑھے کو زہر دے کر مار ڈالا۔

کچا گوشت: اس افسانے نے مجھے منٹو کا 'موذیل' اور 'ممی' یاد دلا دیا۔ شاید لکھتے وقت مہر افروز صاحبہ کے سامنے بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ نام بھی منٹو سے مستعار لیا اور ٹھنڈا کی جگہ کچا کر دیا۔

استاد: میں نے کنڑی لوک کتھا نہیں پڑھی لیکن اس کہانی نے مجھے یہ احساس ضرور دلایا کہ حکایات، لوک قصے و کہانیاں کسی ایک علاقے کی نہیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ استاد کی حرمت اور عزت پر ایسی بہت سی لوک کہانیاں ہمارے ہاں بھی پڑھنے کو ملتی ہیں۔

ٹوٹتی سرحدیں: میں نے وہ دیوار بھی جو مشرقی برلن اور مغربی برلن کو الگ کرتی تھی، ٹوٹتے دیکھی ہے اور عبداللہ حسین کے افسانے 'جلاوطن' میں بھی اس دراڑ کو دیکھا ہے۔ کیا عجب کہ وہ مصنوعی سرحدیں جو اور کئی جگہ موجود ہیں، ایک روز یوں ٹوٹیں جیسے افسانے میں ٹوٹتی نظر آتی ہیں۔

کٹی پتنگ: یہ افسانچہ ایک نوحہ ہے، اک تمنا ہے، اک خواہش ہے، بلکہ ایسی عورتوں کی، جن کا پلہ کبھی

کسی بندھن میں بندھا تھا لیکن وقت نے اسے ایسے کاٹا کہ وہ بالآخر خس و خاشاک بنئیں گندے نالے میں بہہ رہی ہیں۔

دہشت گرد: ایسی ناانصافیاں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ بندہ چاہے مذہبی ہو نہ ہو، دہشت گرد ہو نہ ہو، اس کی ٹانگ کھینچنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں جو آزمائے جاتے ہیں۔

ادھوری عورت: یہ کٹی پتنگ کی طرح ایسی ہی عورتوں کی کہانی ہے جو مکمل تو ہونا چاہتی ہیں لیکن وقت ایسے بے رحم گھاؤ لگاتا ہے کہ وہ سمجھوتوں میں ہی الجھ کر بلکتی رہتی ہیں، جیسے سارہ تب بلکتی ہے جب ماہر اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔

میں نے یہ افسانے 'تنقید' کی عینک چڑھا کر نہیں پڑھے، افسانوں کی تاریخیت کیا ہے، ہیئت کیا ہے، جمالیات کے اعتبار سے افسانے کیسے ہیں، ساختیات کی پاسداری کرتے ہیں یا نہیں، ان میں پس ساختیات کچھ ہے یا نہیں، ان پر تشکیل اور رد تشکیل کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں، یہ راست بیانیہ ہیں یا میٹا فکشن کے زمرے میں آتے ہیں۔ اسی طرح میں نے ان پر فرائڈ، مارکس، سارتر یا دیگر کے حوالے سے کسی تھیوری کا بھی اطلاق نہیں کیا۔ میں نے انھیں صرف ایک عام قاری کی حیثیت سے پڑھا ہے اور ان کی نرمی و تلخی، ان کے سرد، گرم، بہار اور خزاں کے موسموں کو دیکھا ہے۔ مجھے ان افسانوں میں موجود سارے کردار، چاہے ان کے نام اور ان کا ماحول میرے اردگرد کا نہیں ہے پھر بھی یہ مجھے نامانوس نہیں لگے؛ ناموں میں کیا رکھا ہے، ہمارے جیسے ملکوں کے ماحول لگ بھگ ایک جیسے ہوتے ہیں، کرناٹک کچھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں کا پنجاب، وہاں بھی ایک اکثریتی آبادی ہے اور باقی اقلیتی، ہمارے ہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے؛ ایسے میں چاہوں بھی تو یہ کہہ کر ان افسانوں کے کرداروں سے جان نہیں چھڑا سکتا کہ یہ سرحد پار کے کردار ہیں۔ یہ سب کسی نہ کسی شکل میں میرے اِرد گرد موجود ہیں۔ میں انھیں مصنوعی بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ حقیقت میں میرے آس پاس کھڑے ہیں، کوئی میری گلی کی نکڑ پر، کوئی لاہور کے عجائب گھر کے باہر، کوئی قدیم لاہور کے کسی محلے میں اور کوئی ان مضافات میں، جنھوں نے میرے شہر کے گرد کھیتوں، کھلیانوں اور جنگلوں کی شکل میں گھیرا ڈال رکھا ہے۔ کٹی پتنگیں، ڈولتی پریاں اور پھڑ پھڑاتے گڈے ہمارے آسمان پر بھی ہیں۔ سرحدیں تو زمین پر ہوتی ہیں لیکن آسمان تو سب کا سانجھا ہے۔ مہر افروز صاحبہ کے ان افسانوں کو پڑھنے والے، اگر 'قاری' رہیں گے تو ہی لطف اندوز ہو سکیں گے، اگر 'تنقید' کی عینک چڑھا کر پڑھا تو سب مزہ کِرکِرا ہو جائے گا۔

قیصر نذیر خاورؔ

مہر افروز کی افسانہ نگاری ۔۔۔ایک تجزیاتی مطالعہ

مہر افروز کے افسانوں میں اُن کی سوچ کی نُدرت اور جدّت کے ساتھ مشاہدے کی گہرائی اور اُن کے عصری حُسن کے حالات کی ترجمانی واضح نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں کا مواد اپنے اردگرد کے ماحول سے لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں ہمیں اپنے جیسے انسانوں کی زندگی کی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تصویریں جو ہر آن بدلتے ہوئے حالات کا پَرتو لئے سامنے آتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہمیں معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی کروٹوں اور اُن کے پس پردہ محرکات وعوامل کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

اُن کے افسانوں کی انفرادیت اس حوالے سے بھی ہے کہ اُن کے اندر ایک تنوع اور رنگا رنگی کی صورت ملتی ہے جو اُنہیں ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممیز کرتے ہوئے ایک الگ شناخت اور پہچان عطا کرتی ہے۔ یہ تنوع اور رنگا رنگی جہاں اُن کے افسانوں کو نئی جہات سے ہمکنار کرتے ہیں وہیں قاری پر افسانہ نگار کی سوچ اور فکر کے لئے نئے ابعاد کو بھی واضح کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ افسانہ نگار کی سوچ اور فکر کا دائرہ محدود نہیں۔ یہی چیز جہاں اُن کے افسانوں کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے وہیں اُن کے تاثر کو عمیق تر کرتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری جیسے جیسے اُن کی کہانیوں کو پڑھتا ہے اُن کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہتا۔ اُس کے سامنے روایت سے ہٹ کر زندگی کے نئے نئے پہلو اور جہات اُجاگر ہوتی چلی جاتی ہیں۔

مہر افروز کی سوچ اور فکر کا کینوس محدود نہیں بلکہ بے حد وسعت کا حامل ہے۔ وہ انسان سے کائنات اور پھر کائنات سے انسان کی جانب سفر کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ سفر تجسس، حیرت اور انکشافات سے بھرپور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں کا دائرہ کسی ایک علاقے اور خطے تک محدود نہیں رہتا بلکہ یونیورسل اور آفاقی ہو جاتا ہے۔ یوں وہ ہر قسم کے امتیاز اور تفریق سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں کے مجموعی حقوق نیز انسانی روایات واقدار پر محیط ہو جاتا ہے۔ اُن کی یہی وسیع المشربی، رواداری اور بھائی چارے کی سوچ اُن کے افسانوں میں نئے نئے رنگ بھرتی ہے اور اُن کے تاثر اور معنویت کو دوچند کر دیتی ہے۔

مہر افروز کو کہانی بُننے کا فن آتا ہے۔ وہ پلاٹ کی تشکیل پر مہارت رکھتی ہیں۔ کردار نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری نیز ماحول کی عکاسی پر ان کے قلم کی دسترس نمایاں ہے۔ اُن کے افسانوں کی زبان سادہ اور دل نشین ہے۔ اسلوب رواں اور سلیس ہے۔

اُن کے افسانوں کے مطالعہ سے جہاں اُن کے عصری شعور کی مختلف جہات کا پتا چلتا ہے، وہیں انسانوں کی نفسیات، ان کی بوالعجبیوں، نیز ان کے پس پردہ عوامل اور محرکات کا بھی ادراک ہوتا ہے۔ انسانوں کے باطن میں ہونے والی ہلچل نیز انسانی ذات کا کرب اور اس کا مطالعہ اور مشاہدہ اُن کے متعدد افسانوں کا موضوع بنا ہے۔ اس ضمن میں اُن کے افسانے ''ادھوری عورت'' کو بطور حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ افسانہ ایک عورت کی ذات کے کرب کو واضح کرتا ہے اور اس کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کا مظہر ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ جو بے اولاد ہونے کی وجہ سے ہے اور یہی چیز اس کو ایک ہجرت سے دوسری ہجرت پر مجبور کرتی ہے۔

مہر افروز کے افسانوں میں آنے والی علامتیں اگر ایک طرف عصری حالات اور انسانی نفسیات کے مختلف حوالوں سے جُڑی ہوئی ہیں تو دوسری طرف فرد کی شناخت اور پہچان کے متعدد پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ علامتی حوالے سے اُن کا لکھا ہوا افسانہ ''کٹی پتنگ'' خاصے کی چیز ہے۔ کٹی پتنگ کی علامت اپنے مرکز سے کٹ جانے والی ایک عورت کی زندگی کی کتھا ہے۔ اپنے مرکز سے کٹ کر اس کی شناخت اور پہچان مٹ جاتی ہے۔ اب عورت کا مرکز کیا ہے وہ جاننے کے لئے افسانے کا مطالعہ ناگزیر ہوجاتا ہے۔

اپنے افسانوں کے ذریعہ مہر افروز نے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان قائم سرحدوں اور اُن سرحدوں کے دونوں جانب رہنے والے لوگوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اس ضمن میں اُن کا افسانہ ''ٹوٹتی سرحدیں'' اور اس کے اندر آنے والی ''سرحدوں'' کی علامت کو بطور حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ سرحدوں کی علامت کے ذریعہ اُنھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب یہ سرحدیں نہیں ہوں گی اور یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے مل سکیں گے۔

مہر افروز کے افسانوں میں طوائفوں کی زندگی کے جاندار مرقعے اور تصویریں بھی ملتی ہیں نیز اُن کی محرومیوں اور المیوں کے ساتھ اُن کی فطرت سمیت ان کے ایثار، قربانی اور رواداری کے جذبات کے مختلف

حوالوں کو سمجھنے اور جاننے کا موقع ملتا ہے۔اس ضمن میں اُن کا افسانہ ’’کچا گوشت‘‘ اور اس کی نائیکا سکو بائی کے کردار کو بطور حوالہ دیکھا جاسکتا ہے۔’’سکو بائی‘‘ ایثار اور قربانی کی درخشاں مثال ہے۔

اپنے افسانوں کے ذریعہ مہر افروز نے ان لوگوں کی زندگی کی بھی تصویریں دکھائی ہیں جو مکافاتِ عمل کا شکار ہوتے ہیں۔زندگی میں وہ جو بوتے ہیں وہی اُن کو کاٹنا پڑتا ہے۔اس ضمن میں اُن کا افسانہ ’’پل صراط‘‘ پڑھنے کی چیز ہے۔اسی طرح اُنھوں نے عشق کرنے والے افراد کے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔معاشی اور طبقاتی فرق کیسے ان کے رستے کی دیوار بن جاتے ہیں۔اس تناظر میں اُن کا لکھا ہوا افسانہ ’’پھالگنی‘‘ کو بطور حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے۔

اُن کے افسانوں میں مرد عورت کے جذباتی ہیجانات اور اس کے پسِ پردہ محرکات اور عوامل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ضمن میں کرداروں کی پیش کش نہایت جاندار اور حقیقت پر مبنی ہے۔انسانی جذبات اور احساسات کی عکاس اپنے اندر انسانی زندگی کی بہت سی حقیقتوں اور صداقتوں کو سمیٹے نظر آتی ہے۔اُن کا ایک علامتی افسانہ ’’بلی‘‘ کو اس تناظر میں بطور حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے۔اس افسانے کے دو کردار ’’منی‘‘ اور ’’شانو‘‘ جذباتی ہیجانات کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔

مہر افروز کے افسانوں میں اپنی معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی روایات سے بغاوت کرنے والے لبرل (آزاد خیال) افراد کی زندگی کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔روایات سے اُن کی بغاوت کن مصائب اور المیوں کو جنم دیتی ہے؟ وہ کس طرح اپنی شناخت اور پہچان سے محروم ہو جاتے ہیں؟ اُس کا عکس اُن کے افسانے ’’جھوٹا سچ‘‘ میں واضح دکھائی دیتا ہے۔اُن کے افسانوں کے مجموعی مطالعہ سے یہ بات اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ اُن کا رشتہ برصغیر کی دھرتی اور اُس کے لوگوں سے بڑا گہرا اور اٹوٹ ہے۔انھوں نے کہیں بھی اس رشتے کو کمزور نہیں ہونے دیا۔یہی چیز اُن کے افسانوں کی شناخت اور پہچان کا باعث بنی ہے۔

پروفیسر یونس حسن خان

ٹوٹتی سرحدیں۔۔۔ایک جائزہ

میں نے مہر افروز صاحبہ کے افسانوں پر اظہارِ خیال کے لئے قلم اٹھایا تو قلم عجز و انکساری سے سرنگوں اور ورطۂ حیرت میں گم ہوگیا کہ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔۔۔مجھے قلمِ نارسا کو سمجھانا پڑا کہ اظہارِ خیال کرنے کا مقصد سعادت مندی حاصل کرنا ہے، اور اظہارِ خیال کرنے والوں کی صف میں، چاہے آخر پر ہی نام آئے، شامل ہونا ہے۔

مہر افروز صاحبہ کے افسانے جہاں نما ہی نہیں، جہاں پناہ بھی ہیں۔لسانی جنتر منتر سے اپنے قاری پر ایسا جادو کرتی ہیں کہ وہ ہپناٹائز ہوتا چلا جاتا ہے۔وہ الفاظ کے زینے سے اپنے کرداروں کے دل اور دل سے روح میں اترتی چلی جاتی ہے اور اپنے قاری کو بھی پیچھے پیچھے کھینچے لئے جاتی ہیں یہاں تک کہ قاری بے کنار وسعتوں میں کھو جاتا ہے۔وہ اُنہی جذبات سے ہم کنار ہوتا ہے جو افسانہ نگار نے افسانہ لکھتے وقت محسوس کئے ہوتے ہیں۔ یہاں غالب کا ذکر برجستہ آجاتا ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ آنسو جو افسانہ لکھتے وقت، افسانہ نگار کی آنکھوں میں تیر رہے ہوتے ہیں وہ قاری کی آنکھوں میں امڈ آتے ہیں۔وہ جذبات جو افسانہ نگار کو قرطاس پر اپنی انگلیاں چلانے پر مجبور کر رہے ہوتے ہیں قاری کے دل میں بھی سما جاتے ہیں۔اس وقت مصنف اور قاری ایک ہو جاتے ہیں اور دوسری چیز وہ تحریر ہوتی ہے جو ان دونوں کو اپنے حصار میں لے چکی ہوتی ہے اور یہی ایک عظیم شاعر یا نثر نگار اور خاص طور پر افسانہ نگار کا فسوں ہوتا ہے جس میں مہر افروز کو جمال ہی نہیں کمال بھی حاصل ہے۔اس ہنر آزمائی میں مصنف کا مشاہدہ، تجربہ، نظریہ، خیال اور کمال قاری کے قلب و روح میں اتر جاتا ہے۔پھر من تن شدم، تو جاں شدی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔قاری بھی مصنف کی طرح تخیل و حقیقت کے ان جہانوں کی سیر کرتا ہے جن سے مصنف شناسا ہوا ہوتا ہے۔اور یہی فن نثر و سخن کی معراج ہے۔

مہر افروز کے افسانے اپنے حصار میں خیالوں کی رنگین کہکشاں، مشاہدے کی گہرائی، بصیرت کا حسنِ ادراک، پیش کش کی مہارتِ تامہ، لسانی طلسم گری، جذبات کے سونامی، اور سماجی تجربے کے انبار لئے ہمارے سامنے اپنا دامن وا کرتے ہیں اور پھر ہم اپنے آپ کو اس دامن سے وابستہ ہی نہیں، اس کے اسیر بھی محسوس کرنے لگتے ہیں۔افسانے

چھوٹے ہوں یا بڑے، طلسماتی اثرات میں کمی واقع نہیں ہوتی۔علامتی افسانے تو ذہانت کو چیلنج کرتے ہوئے گزرتے ہیں کہ آؤ دیکھیں کس کی رسائی کہاں تک ہے۔

ہم ذیل میں مہر افروز کے افسانوں کا اجمالی سا تبصرہ پیش کرنے کی جسارت کی اجازت چاہتے ہیں۔حقیقی بات یہی ہے کہ ان افسانوں کا تفصیلی تبصرہ ایک ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔ہم اپنے تبصرے کو معروضی انداز میں کچھ چھوٹے چھوٹے پیرا گرافوں میں پیش کرنے کی کوشش کریں گے اس امید پر کہ یہ تبصرہ ان افسانوں کی تفہیم میں شاید کسی کے کام آسکے۔

مہر افروز کے افسانے اپنے اندر ہندوستان کا بھرپور تہذیبی عکس لئے ہوئے ہیں۔وہ باتوں باتوں میں اپنے آس پاس اور مشاہدے میں آجانے والے تہذیبی پہلو نمایاں کر دیتی ہیں۔ان کے افسانے اپنے ماحول کی آب وہوا میں جنم لینے کے ساتھ ساتھ اسی ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور پھر انسانیت کے ان خاص تہذیبی رویوں اور رنگوں کی قوسِ قزح ذہن کے افق پر بکھیرتے ہوئے اپنے اختتام کو پہنچ جاتے ہیں۔'سپنوں کے قاتل' کا یہ فقرہ ملاحظہ فرمائیں:"سوری اس محلے میں مسلمانوں کو گھر دینا منع ہے۔سوری ہم اس میں وشواس تو نہیں رکھتے مگر کیا کریں محلے والوں سے دشمنی بھی نہیں لے سکتے۔"

افسانے کی جان جذبات کا تلاطم ہوتا ہے جو پلک جھپکتے ہی قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔مہر افروز کو جذبات کا یہ تلاطم بننا بہت خوبی سے آتا ہے۔وہ نہ صرف خود جذبات میں شوریدہ سر محسوس ہونے لگتی ہیں بلکہ اپنے کرداروں کو بھی اس بھنور کی لپیٹ میں لینے کے ساتھ ساتھ کوسوں دور بیٹھے قاری کو بھی جذبات کی زور آور لہروں میں کہیں گم کر دیتی ہیں۔اور پھر افسانے کا کنارہ آتے آتے وہ خود جذبات کے منجدھار میں پہنچ چکا ہوتا ہے۔ان کے افسانے 'کچا گوشت' سے ایک فقرہ:"تم ذلیل حرامی کُتے، تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی؟ وہ چیخ پڑی، اس کی آواز میں ہذیان، نفرت حقارت، شدت جانے کیا کیا تھی۔"

لسانی پہلو سے تو جیسے مہر افروز کے افسانے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔زبانِ اردو کو تو انھوں نے چار چاند لگا دینے کے ساتھ ساتھ اس سلیقے سے برتا ہے کہ لسانی مطالعہ کرنے والوں کو اس میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھنے کا مواد بھی مل سکتا ہے۔اردو زبان میں جس انداز میں انگلش الفاظ کی رم جھم برکھا برس رہی ہے اس کا لطف ان افسانوں کی زبان سے بحسن وخوبی اٹھایا جا سکتا ہے۔انھوں نے اردو زبان کی موجودہ ہیئت کو قلم بند کر کے اردو زبان کی تاریخ ساز خدمت کی ہے جو آنے والی صدیوں میں اردو ادب کے لسانی تاریخ داں کے کام آتی رہے گی۔اس ضمن میں بات کافی وسیع ہونے کا احتمال ہے اس لئے ہم صرف اختصار میں بات کریں گے کہ اول تو انھوں نے اردو کلاسیکی محاوروں اور روزمرہ کے الفاظ کا برجستہ و برمحل استعمال کیا ہے۔دوم یہ کہ انھوں نے لوگوں کے منہ کی زبان یعنی استعمال میں آنے والی زبان کو قلم بند کیا ہے۔علاقائی الفاظ اور محاوروں کا خوب فائدہ اٹھایا گیا ہے۔یہ اوصاف ان کی علمیت اور

مشاہدے پر دلالت کرتے ہیں ۔:'' سوریہ کے بابو سنا تم نے پھالگنی کا رشتہ آیا ہے ۔پڑوس کے گاؤں کے زمیندار کا بیٹا وشنو اس سے بات پکی ہوگئی ہے ۔شاید کل پرسوں شگن آجائے ۔''

پھالگنی : لڑکی کو اللہ تعالیٰ نے بڑی فرصت میں بنایا تھا۔

پل صراط : جو اس کے علاوہ نئی لائی گئی لڑکیوں کی برین واشنگ اور دیکھ بھال بھی کرتی ۔

کچا گوشت : 'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے اصلاح' دنیا بھر کی زبانوں کے ادب کے دو زمرے رہے ہیں اور ان پر بے حد وحساب بحث وتمحیص بھی ہو چکی ہے ۔

مہر افروز ان دو زمروں میں سے اپنے لئے 'ادب برائے اصلاح' کو منتخب کرتی نظر آتی ہیں ۔ان کی زندگی کا کوئی عظیم مقصد ہے جو ان کو سیماب کی مانند بے تاب ومضطرب رکھتا ہے ۔وہ مقصد انسان کی اصلاح ،فلاح اور بقا ہے ۔وہ انسان کی بہتری کے لئے الفاظ کا تانا بانا بنتی ہیں اور ان کو ادب کی اعلیٰ ترین سطح کی آرٹ سے سجا کر انسانوں کی بہبود پر نثار کر دیتی ہیں ۔وہ اپنی ذات کی شہرت و برتری کے پیشِ نظر ادب کی وادیوں کی سیاح نہیں بنتیں بلکہ وہ اپنا غم اور فکر الفاظ کے کیپسولوں میں بھر کر دوسرے انسانوں کے ذہنوں میں اتارنا چاہتی ہیں ۔اس ضمن میں وہ مذہب ،علاقہ ،زبان ،رنگ ونسل وغیرہ کی حدود کو توڑتی چلی جاتی ہیں ۔ان کا ہر افسانہ کسی نہ کسی معاشرتی برائی ،محرومی یا زیادتی کی غمازی کرتا ہے ۔

کسی کی اصلاح وفلاح کے لئے لکھنے والے کو انسانی نفسیات پر زیادہ مہارت اور گرفت کی ضرورت ہوتی ہے ، کیوں کہ اس کی حیثیت مصلح جیسی ہوتی ہے جس کی بات کوئی سننا پسند نہیں کرتا یا اس کی حیثیت کڑوی دوائی پلانے والے اور ٹیکہ لگانے والے ڈاکٹر کی سی ہوتی ہے جسے دیکھتے ہی بچے چلانے لگتے ہیں ۔لہٰذا ایسے تخلیق کار کو انسانی نفسیات کی رگ رگ سے واقف ہونا پڑتا ہے ۔مہر افروز بھی انسانی نفسیات کی ماہر نباض محسوس ہوتی ہیں ۔وہ اپنے قاری کی نفسیات کو یوں اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں جیسے عقاب اپنا شکار اغوا کر لیتا ہے ۔وہ اپنے کرداروں کی نفسیات کا تانا بانا کچھ اس طرح بنتی ہیں کہ قاری بھی اس جال میں اپنے آپ کو محصور پاتا ہے ۔قاری کی سوچ باندھ لینا ہی کامیاب افسانہ نگار کا اصل آرٹ ہے جس میں مہر افروز کہنہ مشق ہیں ۔اس ضمن میں ان کا کوئی بھی افسانہ پیش کیا جا سکتا ہے ۔

تصویر کشی کی بھی کہیں کہیں ضرورت پیش آتی ہے ۔مہر افروز کی آنکھوں کے کیمرے ان کے الفاظ کی شعاعوں کے ساتھ قاری کے ذہن کی سکرین پر کرداروں اور مناظر کی تصویریں ابھارنے میں ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں ۔وہ چند الفاظ میں ایک نقشہ کھینچ کے رکھ دیتی ہیں ۔ان کے افسانوں میں جگہ جگہ لفظی مناظر اور نقشے بکھرے پڑے ہیں ۔

گائے کو کھینچ کر وہاں تک لے آیا ۔جھنڈا اور رسی کھول لی ،رسی سے گئو ماتا کو باندھا گیروا جھنڈا اس کے سینگوں پر اٹکا دیا' ۔(زندگی اے زندگی)

وہ پورے چھ فٹ لمبی تھی مرہٹن ،ماتھے پر بڑا سا تلک اور کچھی مار کر ساڑھی باندھتی ،سر پر بڑا سا جوڑا جس میں آبولی

کے نارنجی پھولوں کا گجرا۔(کچا گوشت)

ویسے تو پلاٹ کا زیادہ تر تعلق ڈرامے اور ناول جیسی اصناف کے ساتھ ہی سمجھا جاتا ہے اور ارسطو سے لے کر تاحال پلاٹ اور کردار کی باہمی بحث نے کسی مقام پر رکنے کا نام نہیں لیا۔اگر چہ وقت کے مختلف تناظرات نے دونوں کی باہمی اہمیت کو کئی طرح سے پیش کیا لیکن ہمارا بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نا صرف ڈرامے اور ناول بلکہ کہانی اور افسانے کا پلاٹ بھی ہوتا ہے۔پلاٹ ہی دراصل وہ رسی یا سوچ ہے جس سے واقعات، خیالات اور جذبات باندھے جا سکتے ہیں اور یہی چیز افسانے میں دلچسپی کا مرکز ہوتی ہے۔افسانہ دراصل واقعات سے زیادہ جذبات کا پلاٹ بنتا ہے۔مہر افروز جذبات، خیالات، احساسات اور تفکرات کے پلاٹ بننے میں ید طولیٰ رکھنے والی مصنفہ ہیں۔ان کے افسانوں کے پلاٹ، جذبات و خیالات کی شاہراہوں، کچے راستوں اور پگڈنڈیوں پر سے چلتے ہوئے سوچ کے گھر تک پہنچتے ہیں اور قاری کو وہاں چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جاتے ہیں۔

دورِ جدید ادب میں حقیقت پسندی کے فروغ کا دور بن کر آیا۔اور قدیم افسانوی اور رومانوی تناظرات سے سوچ کو حقیقی زندگی کے مسائل اور حالات کی طرف مبذول کر یا گیا۔مغرب و مشرق میں سماجی، نفسیاتی، معاشی اور ایسے ہی طرح طرح کے مسائل کے حل کی طرف انسانوں کو دعوت دی گئی کہ وہ ان مسائل کے حل کے لئے کوشش کریں۔

مہر افروز بھی چوں کہ معاشرتی اصلاح کی مشعل بردار ہیں، وہ اپنے افسانے انسانی سماج میں پائے جانے والے گھمبیر مسائل کی طرف توجہ دلانے کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔ان کا دردِ دل ان کے افسانوں کی زباں سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ کس قدر انسان کی خیر خواہ ہیں۔وہ خیالستان کی دنیا سے اجتناب کرتی ہیں اور ہندوستان کے مختلف شہروں کے گلی کوچوں سے گزرتی ہوئی خار دار بلند سرحدوں کو بھی عبور کرتی ہیں لیکن رہتی اسی دنیا میں ہیں جہاں کے انسانوں میں اچھائیوں کی کمی اور برائیوں کی کثرت ہے۔ان کا حقیقت پسندانہ انداز ان کے افسانوں کی اہمیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔یہ افسانے ادبِ لطیف کا لطف بھی دیتے ہیں اور اصلاحی خطبے کی کمی بھی پوری کرتے ہیں۔

مہر افروز کے افسانے بنیادی طور پر مقامی مٹی سے فروغ پاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بین الاقوامی وسعت کے بھی حامل ہیں۔یہ اس تناظر میں ہے کہ جدید انسان بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے۔ایک انسان، اس دور میں جہاں بھی ہے، ساری دنیا سے بلواسطہ یا بلاواسطہ منسلک ہوتا ہے۔مزید برآں آج کل برِ صغیر سے باہر بھی برِ صغیر وجود میں آرہے ہیں۔پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے باشندے پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔کاروبارِ حیات میں اپنے حصے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔مہر افروز نہ صرف بھارت بلکہ دنیا بھر کے حالات و واقعات پر نظر رکھنے والی شخصیت ہیں اس لئے ان کے افسانے بین الاقوامی وسعت بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔مثال ملاحظہ ہو: ایک ہندوستانی، ایک پاکستانی، اور ایک بنگلہ دیشی، تینوں الگ الگ دیسوں سے تھے مگر چونکہ مسلمان تھے اس لئے پردیس میں ساتھ تھے(ٹوٹتی سرحدیں)

مہر افروز کے افسانوں کے کردار بہت جاندار، دلچسپ اور متحرک ہیں ۔ان کرداروں کو الفاظ کے کینوس پر ابھارنے کے لئے افسانہ نگار کو بہت گہرے اور مضبوط تخیل میں رہنا پڑا ہوگا۔ان کے کردار آئیڈیل اور حادثاتی بھی ہیں ۔ ہر کردار ایک ایسی زندگی بسر کر رہا ہے جو معاشرے کے کسی خاص دلچسپ گوشے سے منسلک ہے ۔ان کرداروں کی زندگیوں میں حادثات بھی اہم رول ادا کر چکے ہیں اور مزید بھی کرتے ہیں ۔اچھے برے کرداروں کا یہ کارواں انگریزی ادب کے جدِ امجد جیفرے چاسر (Geoffrey Chaucer) کی 'دی پرولوگ ٹو کینٹر بری ٹیلز' (The Prologue to Canterbury Tales) کے کرداروں جیسے ہو جاتے ہیں اور معاشرے کے مختلف پہلوؤں کو ہماری نظر کے سامنے لاتے چلے جاتے ہیں ۔ یہ کردار تنہائی، بے روزگاری، گھریلو و معاشرتی مسائل اور برائیوں کا شکار ہیں ۔ان کی زندگی دوسروں کے لئے اہم چاہے نہ ہو لیکن دلچسپ ضرور ہے ۔ان کی زبان، حرکات وسکنات، جذبات و تفکرات دوسروں کی سوچ کا مرکز بن جاتے ہیں ۔ایسے لگتا ہے کہ معاشرے کا کوئی اہم کردار اور گوشہ مہر افروز کی ضوفشانی سے بچ نہیں سکا۔

مہر افروز کے افسانے رومانویت اور کلاسیکیت کا خوبصورت مرقع ہیں ۔ یہ زمانہ ہی دراصل رومانویت اور کلاسکیت کا سنگم ہے اور اس زمانے کے تناظر میں لکھے گئے ادب میں بھی دونوں بڑے انداز سے مدغم ہوئے محسوس ہوتے ہیں ۔ برِ صغیر، بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش، معاشرت کے حوالے سے، ابھی آدھے سے زیادہ مشرقی اور آدھے سے کم مغربی ہو سکے ہیں ۔ویسے بھی رومانویت اور کلاسیکیت، اور جدیدیت و روایت پسندی مطلق طور پر علیحدہ بھی نہیں ہو پاتیں ۔مہر افروز کے افسانوں کا ماحول، کردار اور موضوعات میں اتنی وسعت، رنگینی و ہمہ گیریت ہے کہ وہ جدید و قدیم اور رومانویت و کلاسیکیت کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں ۔ان کے افسانوں میں کہیں یونیورسٹیاں اور کالج، کہیں کوٹھے اور کنواریاں، کہیں محلے اور گلیاں، کہیں گاؤں اور مناظرِ فطرت، الغرض کیا ہے جو موجود نہیں ۔

علامت کا استعمال ادب کی شان ہے ۔جس سے ادب کو 'پر' لگ جاتے ہیں ۔علامتی افسانے لکھنا قدرے مشکل اور مختلف فیلڈ ہے ۔مہر افروز نے علامتی افسانے لکھنے میں بھی اپنا قلم آزمایا ہے اور اس کا لوہا منوایا ہے ۔علامتی افسانے اگرچہ عام قاری کے لئے الجھن اور بے رغبتی کا سبب بھی بن سکتے ہیں لیکن ذہین اور عمیق قاری کے لئے ان میں اتنا ہی زیادہ لطف اور حظ پایا جاتا ہے ۔'ملی'، 'بے چہرہ' اور 'ٹوٹتی سرحدیں' شاندار علامتی افسانے ہیں ۔

جیسے کہ کہا جاتا ہے چہرہ ذہن کا عکاس ہوتا ہے، ایسے ہی افسانے کا آغاز اس کے باقی وجود کا عکس ہوتا ہے ۔ مہر افروز کے افسانوں کا آغاز اتنا 'پرفتن' ہوتا ہے کہ جیسے کوئی حسینہ رخ سے نقاب الٹ دے ۔وہ افسانے کا آغاز شکاری کے جال پھینکنے جیسا کرتی ہیں اور پھر قاری کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ جال میں پھنسا ہوا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ اسے آرام بہت ہے ۔

مہر افروز کے افسانے اپنے ٹائٹلز کا بہترین جواز پیش کرتے ہیں ۔وہ اپنے عنوان کی توضیح و توجیہہ کا حق ادا کر دیتے ہیں ۔اگرچہ ٹائٹل کہانی کو چھپائے رکھتے ہیں لیکن کہانی کا اختتام ہمیں ایک بار پھر کہانی کے آغاز پر لے آتا ہے

اور کہانی کا اختتام پھر سے اس کا آغاز بن جاتا ہے۔ افسانے کے عنوان کی دھیمی دھیمی خوشبو افسانے کے سارے منظر و پس منظر میں سمائی رہتی ہے اور قاری اس سے محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ کوئی ایک افسانہ بھی اپنے عنوان کی چھت کے نیچے سے سرکتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔

مہر افروز صاحبہ الفاظ کی کفایت شعاری سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ضرورت سے زیادہ بات کرنے کو اخلاقی کمزوری گردانتی ہیں وہ الفاظ کی ایکانمی (Economy of words) کا بہت خیال رکھتی ہیں اور ضرورت سے زیادہ الفاظ کا قاری کے ذہن پر بوجھ نہیں پڑنے دیتیں۔ وہ بامقصد اور جاندار مکالمے تحریر کرتی ہیں اور کسی چیز کے متعلق بات کرتے ہوئے باتونی پن کا کبھی شکار نہیں ہوتیں۔ اگر چہ خواتین پر ضرورت سے زائد گفتگو کرنے کا الزام اکثر آجاتا ہے لیکن مہر افروز اپنے آپ کو اس نقص سے مبرا رکھتی ہیں۔ کہیں لفظی بازی گری کا بلاضروت مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

چلتے چلتے اگر فلسفوں اور تھیوریوں کے جھروکوں سے افسانوں پر ایک نظر ڈالتے جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ مہر افروز کے افسانوں میں کارل ماکس کا کمیونزم کا فلسفہ تو عام بکھرا پڑا ہے۔ جگہ جگہ غربت، روزگار اور روپے پیسے کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ فرائڈ کی 'نفسیاتی تحلیل' کا فلسفہ بھی لوگوں کی نظروں، گھروں اور کوٹھوں پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ آئس برگ تھیوری (Iceburg Theory) تو جیسے اس کے افسانوں کے پس منظر میں ہے۔ ہر افسانہ اوپر سے چھوٹا سا لیکن گہرائی میں جائیں تو اپنے اندر ایک دنیا سمیٹے ہوئے نظر آتا ہے۔ کیپیٹلزم کا فلسفہ بھی اکثر و بیشتر مقامات پر اپنا جھنڈا لہرائے ہوئے ہے۔ اس طرح کے کئی ایک فلسفے، نظریئے اور تھیوریاں ان افسانوں کو مزین کرتی ہیں۔

مختصر یہ کہ مہر افروز صاحبہ کی کتاب 'ٹوٹتی سرحدوں' کے افسانے، افسانے نہیں جامِ جہاں نما ہیں۔ یہ دراصل ان کے دل کے ٹکڑے ہیں جو انھوں نے الفاظ کی ڈشوں میں رکھ کر ادب کی میز پر پیش کر دیئے ہیں۔ یہ افسانے، بلاشبہ، اس سے زیادہ تحسین کے مستحق ہیں جتنی کہ میرے جیسا کم فہم انسان کر سکا ہے۔ مہر افروز کے افسانے چراغِ امروز اور کنزِ فردا ہیں۔ یہ ایک انسان کی نہیں بلکہ ایک عہد کی تخلیق ہیں۔ ان افسانوں نے موجودہ عہد کو اپنے اندر سمو کر آنے والی کئی صدیوں کے لئے محفوظ کر لیا ہے۔ اس کا خراج بلاشبہ مہر افروز صاحبہ کو جاتا ہے جنھوں نے اتنی مصروف زندگی سے کچھ لمحے چرا کر قلم و کاغذ کی نذر کیے ہیں اور اس دور کو لفظوں میں امر کر دیا ہے۔ امید واثق ہے کہ ان کے افسانوں پر مشتمل یہ کتاب اردو ادب میں سنگِ میل ثابت ہوگی اور اردو ادب کے بے شمار قاری اور کئی ادیب اس سے استفادہ کر سکیں گے۔ دعا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے منسلک ہونے والے تمام افراد پر اللہ رب العزت کی رحمت اور مہربانی نازل ہو، اور یہ کتاب شہرت و عظمت کی بلندیاں سر کرتی چلی جائے! آمین، ثم آمین!

پروفیسر نیامت علی مرتضائی

مہرافروز کی افسانہ نگاری میں سماجی پیغام

شاعرادیب اپنی اصل میں، اپنے عہد کے شخص کے سماجی، معاشی، سیاسی حالات اس کے ذاتی کرب اور خوشی وغیرہ کو کسی ناکسی حوالہ سے کاغذ پر منتقل کرتے آئے ہیں۔اس کے کاغذ پر منتقل کئے ہوئے لفظ ہی حقیقی انسانی تاریخ ہوتے ہیں۔تاریخ مقتدرہ طبقوں کے قصیدے کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔عہد کے مورخ کو سچائی سے زیادہ چوری سے غرض ہوتی ہے۔وہ شاہوں کے کھاتے میں، وہ کچھ ڈال دیتا ہے جن کی ان کے فرشتوں تک کو خبر نہیں ہوتی۔نہیں یقین آتا تو تاریخ کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، شاہوں کے عہد کے کارنامے اصلاحات وغیرہ ہی نظر آئیں گی۔عام شخص تو خیر کسی کھاتے میں نہیں آتا۔اس بچارے کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں رہی۔ہنر مند باصلاحیت اور ذہین وفطین اور مختلف فیلڈز میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے دور تک نظر نہیں آئیں گے۔تاج محل کی تعمیر غلط تھی یا درست، یہ الگ بات ہے، مگر جس سے پوچھو گے، تاج محل کس نے بنایا، یہ ہی کہے گا کہ شاہ جہاں نے، حالاں کہ وہ مستری نہیں بادشاہ تھا جو زمین پر گری سوئی تک کو اٹھانا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔اس کا بیٹا ٹوپی سلار بھی یہ ہی کچھ تھا۔ہنر مندوں کا کہیں ذکر تک نہیں۔موبائل فون بن گیا ہے، ریڈیو اور وائرلیس وغیرہ ختم ہو گئے۔مارکونی کو کوئی نہیں جانتا کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ سومناتھ کا مندر گرانے والا ہر زبان پر رقصاں نظر آئے گا۔تاریخوں میں مجموعی طور پر سچائی کا قحط ہی سواگت کرے گا۔شخص کہیں نظر نہیں آئے گا ہاں البتہ مخصوص جھولی چھاپ بھی دندناتے اور موج مستی کرتے نظر آئیں گے۔

شاعروادیب کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے بڑوں سے لے کے گلی کے ایک عام شخص کو بھی فوکس کیا ہے اور کسی لگی لپٹی کے بغیر اس کے حالات کو کاغذ پر منتقل کیا ہے۔

بڑوں کے ظالمانہ اور خود غرضی پر مبنی طور و انداز کو مختلف ذریعوں سے واضح کیا ہے۔شاعر کے پاس مختلف شعری حربے ہوتے ہیں اور وہ ان کو تصرف میں لاتا ہے۔افسانہ کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ جھوٹی کہانی ہوتا ہے حالاں کہ افسانہ جھوٹی کہانی نہیں ہوتا، وہ اپنے عہد کے شخص اس کے حالات اور فکری انداز اور مسائل وغیرہ کو بیان کر رہا ہوتا ہے۔اگر حقیقی انسانی تاریخ مرتب کرنا ہے تو افسانوی ادب کو لے لیا جائے، سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔شاہوں اور ان گماشتوں کی انسان دشمنی اور خود غرضی سے پردہ اٹھ جائے گا۔نہیں یقین آتا تو میری گڑیا رانی مہرافروز کے افسانوں کا مطالعہ کر دیکھیں، عصری شخص کا دکھ سکھ پڑھنے کو مل جائے گا۔ان افسانوں کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ میری بچی

آج کے شخص کو کتنا قریب سے دیکھ رہی ہے۔

میری بیٹی مہر افروز حساس واقع ہوئی ہے۔ وہ غلط پر تڑپ اُٹھتی ہے۔ ان افسانوں میں اس کی یہ شخصی حس بخوبی پڑھنے کو ملتی ہے تاہم یہ باور رہنا چاہیے کہ وہ اس شخصی حس کے ہاتھوں مجبور ہو کر، لگی لپٹی سے کام نہیں لیتی، جو دیکھتی اور محسوس کرتی ہے اسی طرح بلا ملمع کاری کاغذ قلم کے حوالے کر دیتی ہے۔ آتے کل کو، اس کے یہ لفظ آج کی شخصی زندگی کو کھول دیں گے اور آج کے شرفا کے کارناموں اور کم زور طبقوں کی حالات کی چکی میں پستی زندگی کو کھول کر سامنے لے آئیں گے۔ آج جو کل کو ماضی ہوگا، کی حقیقی تصاویر پیش کریں گے۔ وہ لفظی تصویر کشی کا ہنر جانتی ہیں اور اس ہنر سے مہر افروز نے اپنی شاعری اور افسانوں میں خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ عورت ہیں، انھوں نے اپنے افسانوں میں عورت اور اس کے مسائل کو ہی نظر میں نہیں رکھا بلکہ ہر طبقہ کے مرد کو اور اس کے کرب اور مسائل کو بھی لفظ عطا کئے ہیں۔ میری بات پر نہیں یقین آتا تو اس کے افسانوں کو پڑھ دیکھیے یقین آجائے گا۔ افسانے پڑھنے کا وقت نہیں ہے تو یہ چند اقتباس ہی پڑھ لیں۔

ادھوری عورت: خاندان والوں نے اسے یہودن کی بیٹی ہونے کی وجہ سے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ پاپا کی مسلمان بیٹی ہو کر بھی ان کے لئے اجنبی اور غیر ہی رہی۔ پاپا کی موت کے وقت اس نے کچھ رشتہ داروں کو دیکھا تو تھا جو بعد میں پلٹ کر کبھی نہیں آئے۔

دہشت گرد: اس کی مذہبی کتابیں دہشت گردی کے نام پر ضبط کر لی گئیں۔ آج وہ فائنل ایگزام جیل سے دینے کے لئے آیا تھا۔

ٹوٹتی سرحدیں: نئی نوکریوں کی تلاش، فکر معاش، بیوی بچوں کو پالنے کی ذمہ داری، ان کے چہروں کی لکیریں گہری ہوگئیں۔ بالوں میں سفیدی در آئی۔

استاد: شکست اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ دیکھو اب بھی یاد کرو۔ انسان نہ سہی کسی جانور یا پرندکو تم نے ایسا کرتے دیکھا ہو۔ رشی کی آواز میں ہم دردی اور تاکید واضح تھی۔ استاد کی نظر کرم علم کو مکمل کرتی ہے، کہتا ہوا رشی اپنی راہ چل دیا۔

پل صراط: پیسہ جہاں ضرورت سے زیادہ آجائے تو اس بندے کو جس کے پاس منصوبہ بندی اور غیر اندیشی ہو تو پھر عیاشیاں ہی در آتی ہیں۔ زندگی بھر کھایا پیا انسان جس نے بیوی بچوں کو رعایا بنا کر راج کیا ہو اسے قید تنہائی کب بھاتی ہے۔

پھالگنی: یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں صاحب! ان کا باپ مرگیا ہے۔ یہ تھوڑی سی زمین رہ گئی ہے جو ہمارا آخری سہارا ہے۔ پنچایت کا ادھیکش اسے بھی ہتھیانا چاہتا ہے۔ میں اسی کی شکایت لے کر آپ

کے دفتر گئی تھی صاحب۔ وہ آپ کا افسر میری نہیں مان رہا۔ بابا الیکشن میں ہار گئے۔ الیکشن میں زمینیں بک گئیں اور بابا ہار سنبھال نہ سکے۔ زمینوں سے زیادہ ان کو ہار کا بہت دکھ تھا۔ وشنو کا کیا ہوا تھا۔ شراب اسے پی گئی صاحب! خون تھوکتا مر گیا۔

تعمیرِ نو: اور بھوک ہر مرہم پر بھاری ہوتی ہے۔ ہر درد کا مرہم وقت ہوتا ہے اس کے پیٹ میں اٹھتی مروڑ اسے خیمے سے باہر لے آئی۔ کھانے کے حصول میں لگی کیمپ کی لمبی قطار نے اسے مایوس کر دیا۔ وہاں کی چیخ و پکار اور دھکم پیل سے وہ خوف زدہ ہو کر خیمے میں واپس آئی۔ سوچا بھوکی رہے پر اس ذلت سے نہ گزرے۔

سپنوں کے قاتل: سوری اس محلے میں مسلمانوں کو گھر دینا منع ہے۔ ہم اس پروشواس تو نہیں رکھتے مگر کیا کریں، محلے والوں سے دشمنی بھی نہیں لے سکتے، یہ سیکولر کہلانے والوں کا جواز ہوتا۔

ان چند سطور پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اس نوع کے سیکڑوں جملے ان افسانوں میں مل جائیں گے۔ خود ملاحظہ فرمالیں کہ یہ جملے کہاں تک آج کی حیات کے عکاس ہیں۔ کیا مؤرخ نے کبھی شخصی حالات، جذبات اور مسائل کو فوکس کیا ہے۔ اسی معاشرت میں رہتے ہوئے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی وہ انھیں نظر نہیں آتے۔ چوری سے نظر ہٹے تو انھیں چیتھڑوں میں ملبوس جیون نظر آئے گا۔

مکھی پہ مکھی مارنے، لکھے لکھائے، گھڑے گھڑائے کو نئے نئے انداز و اطوار میں پیش کیا جاتا رہا۔ شاہوں یا ان کے گماشتوں کے خلاف بولنے والوں کے لئے فتویٰ سازی کا عمل بھی جاری رہا۔ حق سچ لکھنے والے سرکاری سولی یا پھر زہر پیتے نظر آتے ہیں۔ شاعر اشاروں اور علامتوں میں سچ کہہ دیتے ہیں مثلاً رحمٰن بابا کس خوبی سے اور ننگی عہد کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

مجنوں کا کوئی کیا حال پوچھے یاں ہر گھر صحرا کا نقشہ ہے

بیٹی مہر افروز نے بھی اپنے افسانوں میں سچ کا دامن تھامتے ہوئے اپنے عہد اور اس کے شخص کی تاریخ لکھ دی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے افسانوں کے عنوان بھی عصری حیات کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ادھوری عورت، دہشت گرد، کٹی پتنگ، جھوٹا سچ، بے چہرہ، سپنوں کے قاتل وغیرہ جس کے لئے وہ تحسین کی مستحق ہے۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن صحت عین غین سی ہے۔ اس کی زبان جو نئے نئے مرکبات اور محاوروں کا مجموعہ ہے، پر کہنے کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دعا ہے اللہ انھیں سلامت رکھے اور اسی طور سے قلم کے سہارے حق سچ لکھتی رہیں۔

ڈاکٹر مقصود حسنی

ٹوٹتی حدیں

افسانوی مجموعہ

مہرافروز

ادھوری عورت

کوالالمپور کی روشنیوں سے جگمگاتی پر رونق سڑکیں، ہلکی خنک شام، سیاہ لباس پر سیاہ شال لئے وہ اُس شاپنگ مال میں داخل ہوئی۔ دن بھر کی تھکن اتارنے کا خیال سب سے بہتر یہی تھا کہ مال میں لگے کتابی میلے میں جا کر کچھ نئی کتابیں خرید لے یا کوئی نیا سوئٹر لے اور کچھ کھا پی کر جلد لوٹ آئے۔

مال کی چکا چوند روشنی نے کچھ دیر کے لئے اس کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا پھر آہستہ آہستہ بینائی بحال ہوئی تو اسے کتابوں کے اسٹالز نظر آنے لگے۔

اس نے کئی اسٹالز پر امریکی بیسٹ سیلر اور پینگوئن کی کتابیں دیکھیں، مگر کوئی اسے پسند نہ آئی۔ ملائشیا اور انڈونیشیا کے کئی اسٹالز بھی اس نے دیکھے، کتابیں دیکھتے دیکھتے کافی دیر ہوگئی تھی۔ تھکان جو پہلے سے ہی اس پر غالب تھی مزید بڑھ گئی، اور اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ اگلا اسٹال برصغیر کے ممالک کا تھا اور ساتھ میں کافی کا اسٹال بھی۔ اسے کافی کی طلب ہوئی، اس نے کافی کاؤنٹر سے کافی کا ایک بڑا مگ خریدا اور اپنے ملک کے سٹال پر آ کر رکی اور پاس پڑے سٹول پر بیٹھ کے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے، کتابوں کی ریکس پر نظریں دوڑانے لگی۔ مگر ایک سیاہ پشت اس کے دیکھنے کی راہ میں حائل تھی۔ وہ کبھی اِس ریک سے کتابیں نکال کر اُس ریک میں لگاتا، کبھی اسی ریک میں کتابیں آگے پیچھے کرتا، کبھی دائیں سے بائیں درست کرتا تو کبھی بائیں سے دائیں، شاید اسٹال کا مالک تھا، اپنے طریقے وسلیقے سے کتابیں لگا رہا تھا تاکہ ان کی نمائش اچھی طرح ہو سکے۔

کافی دیر تک وہ کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر، کافی کی گرمی اور ذائقہ کا مزہ لیتی رہی، جیسے ہی اسے لگا، توانائی اس کے اندر ابھر رہی ہے تو وہ دوبارہ تازہ دم ہو کر اٹھی، کافی کے کاغذی مگ کو مروڑ کر کچرا دان میں پھینکا اور شال درست کرتی ہوئی برصغیر کے ممالک والے اسٹال پر چلی گئی۔ یہاں اس کے ذوق کے مطابق کتابیں تھیں۔ جیسے ہی وہ اس سیاہ پشت کے قریب پہنچی، وہ مڑا، اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ مگر وہ اسے پہچان نہیں سکی، اس کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھ کر اس کے مسکراتے لب سکڑے اور روشنی کا جھماکا کرتی آنکھیں ماند پڑ گئیں۔ مگر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر چونکے ضرور تھے۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ کر کتابیں دیکھنے لگی، مگر وہ آنکھیں اور ان آنکھوں کا جگمگا اٹھنا اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں چبھ رہا تھا۔ یہ آنکھیں میں نے کہاں دیکھی ہیں؟ یہ کون ہے

؟یہ آنکھیں اتنی جانی پہچانی کیوں ہیں؟ یہ سوال اس کے ذہن میں کلبلاتے رہے۔ان کے ساتھ کون سی یاد جڑی تھی ؟بے خیالی میں کتابیں دیکھتی اس نے کافی کتابیں ،ریکس سے اٹھالیں اورادائیگی کے لئے کاؤنٹر پر آئی ،وہ وہاں نہیں تھا۔اس نے پرس ٹٹولا رقم ناکافی تھی۔اس نے اپنا کریڈٹ کارڈ نکالا اوراس سے پہلے کہ ادائیگی کرتی ،اس کی آواز پیچھے سے ابھری؛"مادام !کیامیں آپ کے ساتھ ایک تصویر کھنچوا سکتا ہوں؟"

وہ بہت شستہ انگریزی میں مخاطب تھا اور مجسّم التجا بنا ہوا تھا۔وہ کچھ دیر کے لئے ہچکچائی پھر اس نے تھوڑے توقف کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔اس نے اسے تھوڑا پیچھے ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنا کینن کیمرہ کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے کے حوالے کیا،اس کی کچھ کتابیں اپنے ہاتھ میں لیں اور کیمرے کی طرف رخ کر کے کتابیں پکڑنے کی درخواست کرتے ہوئے وہ اس سے کچھ اور قریب آگیا۔دونوں نے مسکراہٹ اپنے چہروں پر سجالی۔کیمرے نے وہ قیمتی لمحہ قید کرلیا۔"مادام ،آپ کا بہت شکریہ۔"

وہ سراپا سپاس گزار تھا۔کتابوں کو بڑے سے شاپر میں رکھتے ہوئے اس نے اپنا کارڈ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔اس کی متجسس نظروں نے کارڈ پڑھا۔

'ماہر اختر ،اطفال پبلیکیشنز' اور'اوراق ،حیدرآباد' لکھا دیکھ کر اس کی یاد کے دریچے وا ہوتے ہوتے پھر بند ہو گئے۔ماہر اختر یہ نام ،یہ آنکھیں ،مگر ایک پچاس سے تجاوز کرتا شخص جس کی داڑھی کے بال اور سر برف سے زیادہ سفید لگ رہا ہو،جو اس کے وقار اور متانت میں اضافہ کر رہے تھے،جو سلیقہ دار سیاہ سوٹ میں ملبوس ،قیمتی خوشبو مہکا رہا ہو اور برطانوی لہجے میں انگریزی بول رہا ہو،اس سے مزید استفسار مناسب نہیں لگا۔وہ آہستگی سے شاپر ہاتھ میں لئے کچھ ایسی کنفیوژ ہو کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی کہ اسے کھانا کھانا اور سویٹر خریدنا بھی یاد نہ رہا۔

وہ رات بھر بے چین رہی ،دو روشن آنکھیں اسے بار بار گھورتی رہیں ،خواب اور بے خوابی کے درمیان کئی منظر آئے اور گزرے ،وہ سوچیں تھیں یا خواب کا کوئی منظر ،وہ امتیاز نہ کرسکی۔حسب معمول جب جاگی تو خالی گھر ،تنہا کچن دیکھ کر اسے وحشت محسوس ہوئی۔یہاں تک کہ اپنے سائے سے بھی گھبرانے لگی۔گھر میں کوئی ذی نفس نہیں تھا ،وہ بوجھل قدموں سے باورچی خانے میں داخل ہوئی ،بے دلی سے توس سینکے ،انڈا ہاف بوائل کیا اور کافی کے ساتھ زہر مارنے کی کوشش کرتی رہی۔آج اسے تنہائیاں بہت کھٹک رہی تھیں۔یہ زندگی اس کا اپنا انتخاب تھی ،وہ اس کی تو عادی تھی مگر آج یہ بوجھ کیوں لگ رہی تھی؟ اچانک گھڑی کی طرف نگاہ اٹھی جس

میں 9 بج رہے تھے۔اسے یاد آیا کہ ابھی تو اسے ایک گھنٹے کی ڈرائیو کرنا تھی۔وہ وقت کی بہت پابند تھی، اگر اس کو دیر ہو جاتی تو دفتری عملہ پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا۔

دفتر میں سارا دن سخت گزرا میلز دیکھیں، کئی نئے تجارتی معاہدوں کی فائلوں پر، جن کی ڈیل ہو چکی تھی، منظوری کی سفارش کر کے دستخط کیئے اور محمود کے کیبن میں پہنچا دیں تاکہ وہ آخری نگاہ ڈال کر منظوری دے دے۔کئی بار وہ دماغی طور پر غیر حاضر رہی جسے اس کے پرسنل اسسٹنٹ نے بھی محسوس کیا۔

''میم! آر یو او کے ٹوڈے؟''

''میں ٹھیک ہوں، بس کچھ تھکان ہے شاید موسم کا اثر ہے۔''وہ اسے ٹال گئی۔

''سارے کاغذات پر میرے دستخط چیک کر لیں اور محمود کے کیبن میں رکھوا دیں۔''وہ ہدایات دے کر اٹھی تو شام اتر چکی تھی۔سات بجے نادانستہ طور پر وہ اسی اسٹال پر پھر پہنچی، جہاں کل وہ کچھ ادھورا چھوڑ گئی تھی، شاید وہ بھی اس کا منتظر تھا۔

''ہائی، نائس ٹو سی یو'' کہتے ہوئے اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔کچھ جھجکتے ہوئے اس نے بڑھے ہاتھ سے ہاتھ ملا دیا۔اس کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط اور گرم تھی، مگر لمس سخت اور کھردرا تھا، جو کسی بھی طرح اس کی نفیس شخصیت سے میل نہیں کھا رہا تھا۔

''پلیز کم اِن سائیڈ'' وہ اس سے مخاطب تھا۔جیسے ہی اسٹال کے اندر داخل ہوئی ایک بڑی سی تصویر اس کا استقبال کر رہی تھی جو سارے بھید عیاں کر رہی تھی۔کل کا قید لمحہ اپنے تمام تر حسن کے ساتھ بڑی سی فریم میں نمایاں تھا۔وہ ایک دوسرے کو کمپلیمینٹ کر رہے تھے۔مگر تصویر کے دوسرے حصے میں کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے کی بجائے ایک منحنی سا سانولا سلونا لڑکا کھڑا تھا جو ہاتھ میں تھیلا لئے کالج اور اسکولز کی اسٹیشنری بیچ رہا تھا، جس کے چہرے پر، مفلسی اور بھوک تھی، بے بسی رقم تھی، جس کے پیچھے حیدر آباد شہر کا وہ مشہور کالج تھا جہاں وہ پڑھا کرتی تھی۔ایک پرانی اور ایک نئی دو تصویروں کو ملا کر شاید وقت کے فاصلے کو کم اور کسی شناخت کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اور نیچے لکھا تھا۔

'Sara Madam at our stall۔'Indonesian Book fair 2015'

وقت نے فاصلوں کو سمیٹا اور وہ روشن آنکھیں اپنی پوری صداقتوں کے ساتھ واضح ہو گئیں۔دونوں تصویروں میں جہاں عمر، وقت، فاصلے، اور معیشت کا واضح فرق تھا، جو انسان کی پہچان بناتی اور بگاڑتی ہیں، وہیں ایک چیز

مشترک تھی، دو چمکدار روشن آنکھیں جن میں کچھ کر گزرنے کے جذبے موجزن تھے۔ایک عزم، ٹھہراؤ، یقین اور جوش۔ یکا یک وہ اسے پہچان گئی، جو کالج کے داخلی دروازے کی بائیں طرف کھڑا اسے ملا کرتا تھا۔

’’تم !اور یہاں...!‘‘ وہ مجسم سوال تھی۔

وہ اس لڑکے کو روزانہ دیکھتی تھی جب پاپا اسے کالج کے گیٹ پر کار سے اتارتے اور وہ انھیں الوداعی ہاتھ ہلاتی تو دوسری نظر ہمیشہ اس لڑکے پر پڑتی، جس کی آنکھیں ہمیشہ اس سے کچھ کہہ رہی ہوتیں، مگر جنھیں سمجھنے کی اسے فرصت تھی نہ ضرورت اور نہ دلچسپی ہی۔ وہ سر جھٹک کر گیٹ کے اندر داخل ہو جاتی۔ شام میں جب وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ باہر نکلتی تو اسے وہیں کھڑا پاتی۔ وہ اس وقت اپنی سارے دن کی کمائی گن رہا ہوتا۔ وہ سوچتی، سارا دن یوں کھڑا رہتے ہوئے یہ تھکتا نہ ہوگا؟ اسے تو ہماری طرح پڑھنا چاہیے تھا مگر یہ کمانے میں لگ گیا ہے، غربت انسان کو پڑھائی کے عیش بھی کہاں دیتی ہے۔ مگر جیسے ہی اس کی نظر اٹھتی اسے لگتا اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی ہے اور وہ خود کو ہلکا محسوس کر رہا ہے۔ اسے لگتا، وہ اسی کے انتظار میں وہاں شام تک کھڑا رہتا ہے۔ کالج بس جیسے ہی آتی وہ ساری، شور وغوغا کرتیں، اس میں سوار ہو جاتیں۔ اور پھر ذہن سے ہر منظر غائب ہو جاتا۔

پھر ایک دن وہ اچانک غائب ہو گیا۔ اس کا ہیولا اور آنکھیں اسے کئی دن تک یاد رہیں۔ خاص کر وہ جھیل آنکھیں اس کے ذہن سے چپک گئی تھیں، جو اسے دیکھتے ہی چمک اٹھتی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ آنکھیں اس کے لاشعور کا حصہ بن گئیں اور زندگی آگے بڑھ گئی۔

آج کئی سالوں بعد وہ آنکھیں، دوبارہ اس کے سامنے تھیں۔ بس حلیہ اور حیثیت کا فرق تھا۔ چند لمحوں میں وہ سالوں کا سفر کر آئی۔ ’’کیا ہم اکٹھے کافی پی سکتے ہیں؟‘‘ اس کی مضبوط مردانہ آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ کافی سٹال پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے، ویسے ان دونوں میں کوئی رشتہ اور عہدو پیمان نہیں تھا، سوائے دو آنکھوں کے جو ایک دوسرے کو دیکھتی تھیں۔ مگر دیارِ غیر میں کوئی اپنا، ہم مذہب، ہم زبان، ہم وطن مل جائے تو سو رشتوں پر بھاری پڑ جاتا ہے۔

’’آپ یہاں کیسے؟ لباس دیکھ کر تو لگتا ہے آپ یہیں رہتی ہیں....‘‘

’’جی،‘‘ وہ آہستہ سے بولی ’’اب یہیں کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ اپنے ملک لوٹنا چاہوں بھی تو نہیں جاسکتی۔ کون ہے وہاں؟ کس کے لئے جاؤں؟ اب یہیں کی شہریت ہے جو شناخت بھی بن گئی ہے۔‘‘

’’اور آپ؟‘‘ اب وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

''میں ....!'' وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ کہاں سے شروع کرے۔

''تم کالج کے سامنے سے ایک روز اچانک غائب ہو گئے تھے۔کیا وجہ ہوئی تھی؟'' وہ شاید اُس کی مشکل آسان کرنا چاہتی تھی مگر اس کے چہرے کی گہری ہوتی مسکراہٹ نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

''سوری آپ.... کیا ہوا تھا؟'' اس کا تجسس برقرار تھا شاید وہ سب کچھ جاننا چاہتی تھی۔

''میرے بابا کا انتقال ہو گیا تھا'' اس نے ہلکے سے کھانستے ہوئے گلا صاف کیا۔شاید اچانک امڈ آنے والے دُکھ پر قابو پا رہا تھا، مگر آواز کی نمی واضح تھی۔

''بابا پریس میں جلد بندی کا کام کرتے تھے۔بابا پر اس پریس کے مالک کا کافی قرض بھی تھا اور احسان بھی، جس کی ادائیگی کے لئے مجھے کافی سال پریس میں بیگار کرنا پڑی۔دن بھر پریس میں محنت کرتا اور رات میں سڑک کے کنارے ٹھہر کر ضرورت کی اشیاء بیچتا۔میں نے ماچس کی ڈبیاں،کتابیں، کاپیاں، پنسل، جوتوں کے فیتے،موزے، رومال،سکولوں کے بستے،غرض یہ کہ ہر وہ چیز بیچی جو لوگوں کی ضرورت تھی۔ہمیشہ ضرورت ہی بکتی ہے۔'' وہ ہلکے سے ہنسا۔

''اور آپ کو پتہ ہے کہ میں نے اس کام میں اپنی زندگی کے اٹھارہ سال گزار دئیے۔''

شاید انگریزی بولنا اس کی عادت بن گئی تھی،اردو بولتے بولتے اچانک وہ انگریزی میں شروع ہو جاتا۔

''میں، چونکہ گھر میں سب سے بڑا تھا اس لئے بابا کے بعد گھر چلانا میری ذمہ داری تھی، چھ بہنیں، تین بھائی سب کی پڑھائی، شادیاں اور روزمرہ کے اخراجات۔میں نے بابا کی جگہ پر یہ ساری ذمہ داریاں ادا کیں۔اسی دوران میری ماں نے میری شادی عم زاد سے کر دی۔آہستہ آہستہ دن بدلنے لگے۔میں نے 'اوراق' کی بنیاد رکھی اور اپنا چھاپہ خانہ کھولا۔دن رات کی محنت نے مجھے آج اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔آج اطفال پبلیکیشنز اور اوراق سب سے بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔اللہ کے فضل و کرم سے میں نے تمام تر ذمہ داریاں ادا کر دی ہیں۔بھائی اپنا کاروبار الگ چلاتے ہیں۔بہنیں اپنے گھروں کی ہیں۔میری بڑی بیٹی ڈاکٹر بن رہی ہے، بیٹا بائی کام کر رہا ہے اور چھوٹا ابھی دسویں کا امتحان دے رہا ہے۔میں بک فیئرز میں حصہ لینے یہاں سال میں دو مرتبہ آتا ہوں۔اس سماج اور ثقافت کی کہانیاں اپنی زبان میں ڈھال کر اپنے ملک کے بچوں کو نئی دنیا کی سیر کرانا اور وہ سب دکھانا جو میں دیکھتا ہوں یہ میرا جنون ہے،میں بچوں کو ان کا بچپن دینا چاہتا ہوں، جو میں نہیں جی سکا، یہاں کے علاوہ میں دنیا کے اور ملکوں میں بھی جاتا ہوں، وہاں کی

تہذیب اور کلچر کی کہانیاں اورادب اٹھاتا ہوں اور کاپی رائٹس لے کر اپنے ملک میں شائع کرتا ہوں۔ جنون اور پیشہ جب ایک ہو جائیں تو کامیابی کی دلیل بن جاتے ہیں۔میرا پیشہ ہی اب میرا نصب العین ہے اور میں اب اپنے ملک کا اہم اور مشہور پبلشر ہوں۔میرے پاس مال و دولت بھی ہے اور عزت بھی۔“

وہ اردو میں بات کرتے کرتے پھر انگریزی پر اتر آیا تھا اور اس کا آخری قہقہہ بڑا جاندار تھا۔ انسان کو اس چیز پر بہت زیادہ گمان اور استحقاق ہوتا ہے جس چیز کے لئے اس نے اپنی ساری زندگی کی محنتیں لگائی ہوں۔

وہ گہرے اشتیاق سے اس کی کہانی میں گم تھی۔اس کے قہقہے نے اسے حال میں لوٹا دیا۔”دلچسپ بہت دلچسپ اور فیسی نیٹنگ۔مجھے لگا جیسے میں کوئی فلم دیکھ رہی تھی۔دِلی مبارکباد۔مجھے یقین تھا یہ پرعزم آنکھیں کچھ نہ کچھ کر گزریں گی۔“

”اوہ،،بہت رات ہو چلی ہے۔یہ کافی بھی ٹھنڈی ہوگئی۔“

”رکیئے!میں دوسری کافی لے آتا ہوں!“اس کی ستائش بھری نظریں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

کافی ختم ہوئی تو اس نے اجازت چاہی اور وہ اسے روک نہ سکا۔کس حق سے روکتا،وقت کی لمبی دیوار اور رشتوں کی کئی زنجیروں نے اس کی زبان اور قدم روک لئے تھے۔جاتے جاتے وہ اسے اپنا کارڈ تھما گئی۔ اس کے اوجھل ہونے تک وہ اسے تکتا رہا،جب نظروں سے اوجھل ہوگئی تو اس کی نظریں ہاتھ میں تھمے کارڈ پر پڑیں۔

’سارا عبداللہ،عبداللہ پبلی کیشنز،کنگز اسٹریٹ،کوالالمپور۔‘

وہ چونک گیا،اس پبلی کیشنز کی کئی کتابوں کے کاپی رائٹس اس کے پاس تھے۔

کارڈ کو قیمتی اثاثے کی طرح اس نے احتیاط سے اپنے بٹوے کے اندرونی خانے میں لگایا اور پھر اسٹال پر موجود دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

رات دیر تک ایک عجیب بے چینی اس کا احاطہ کئے رہی،لڑکے کو سٹال بڑھانے اور سونے کی ہدایت دے کر،وہ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

نیند،خواب،بے قراری کے چھوٹے چھوٹے دورانیوں میں اس نے رات کاٹی۔صبح دم وہ ساحل پر چہل قدمی کے لئے نکل پڑا۔سمندر کی ساحلی نمکین ہواؤں میں وہ فرحت نہیں تھی کہ اس کے اندر کے حبس

کو ختم کر سکیں۔اندر کچھ تھا جو اس کی اداسیوں میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔کچھ دیر چہل قدمی کے بعد وہ مزید تھکن اور ماندگی محسوس کرتا ہوا ہوٹل واپس لوٹ آیا۔

اگلے تین دن بڑے بے چین تھے۔اس کی بے چینی کسی صورت ختم نہ ہو سکی حالانکہ وہ بڑا عملی اور پریکٹیکل آدمی تھا۔اسے اپنے جذبات دفن کئے، کئی سال ہو چکے تھے۔صرف مادّی چیزوں پر اس کا یقین تھا۔محنت، پیسہ، کاروبار، کتابیں مصروفیت اور کام میں اس نے اپنی ساری زندگی سمو رکھی تھی۔وقت ملتا تو سمندر کے کنارے ٹہلنا اس کی ترجیح ہوتی یا پھر کسی آن لائن دوست سے اس کی گفتگو ہو جاتی۔دنیا بھر سے کئی خواتین و مرد اس کے دوست تھے جن سے وہ ہر قسم کی بات چیت کر لیتا تھا۔حالانکہ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔مگر عملی زندگی نے اسے جو سکھایا تھا وہ کسی بھی یونیورسٹی کی تعلیم پر بہت بھاری تھا۔اس کی ادبی ذہانت کے چرچے ادبی حلقوں میں بہت زیادہ تھے اور بہت سارے لوگ اس سے ملنے کے شائق رہتے۔

مگر آج ایک پرانی یاد، پرانے ہیولے نے اس کے ماضی کو اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا تھا جس نے اس کے دل کی دنیا اتھل پتھل کر دی تھی۔دل جب تک ذہن کے میں قابو رہے سب درست رہتا ہے، جس دن دل عقل کی ماننا بند کر دے، ہر چیز بے قابو ہو جاتی ہے۔آج اس کی بے چینی اس کے ہر عضو پر بھاری تھی۔

ٹھیک گیارہ بجے وہ سارہ کے دفتر میں اس کے کیبن پر دستک دے رہا تھا۔فائلوں میں ڈوبی بار بار کمپیوٹر سکرین پر نظریں ٹکاتی پھر فائلوں کو دیکھتی سارہ، اس کا کارڈ دیکھ کر چونک گئی۔اس نے سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کی اجازت دی۔

’’ویلکم مسٹر ماہر!‘‘ وہ یقین اور بے یقینی کے عالم میں ڈوبی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ماہر کے بڑھے ہاتھ کو مصافحہ کے لئے تھام لیا۔

’’آیئے، آندر آیئے‘‘ کہتے ہوئے اس نے دفتر میں موجود صوفہ کی طرف اشارہ کیا اور خود سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔’’کیسے آنا ہوا؟‘‘ وہ اپنی مسکراہٹ میں اپنا تحیر چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

’’بس ایسے ہی آپ یاد آئیں، آپ کا کارڈ دیکھا تو سوچا آپ سے تجارتی تعلقات تو ہیں ہی انھیں اور مضبوط کیا جائے۔بس اسی لئے چلا آیا۔آخر آپ بھی تو انہی کتابوں اور اوراق سے جڑی ہیں جو میری بھی حیات ہیں‘‘ وہ فلسفہ جھاڑ رہا تھا۔

’’جی....‘‘اس کی جی کچھ لمبی اور سنجیدہ تھی’’آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’آپ کی کئی کتابوں کے رائٹس تو میرے پاس ہیں باقی کتابیں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘اسی اثناء میں چائے آچکی تھی انھوں نے چائے پینے کے دوران کوئی بات نہ کی۔

’’چلئے میں آپ کو اپنا گودام دکھادوں۔‘‘وہ گودام کی جانب چل پڑے۔

گودام کتابوں سے اٹا پڑا تھا اور سارا کا سارا املائی زبان میں تھا۔

’’کیا آپ ملائی سمجھتے ہیں؟‘‘

’’تھوڑا تھوڑا‘‘ کہتا ہوا وہ کتابوں کو دیکھتا آگے بڑھ گیا۔اسے ایسا لگا کہ وہ ان کتابوں کے لئے ہی یہاں آیا تھا۔وہ تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔

وہ کتابیں لے کر زمین پر بیٹھ چکا تھا اور اس کی طرف سے مکمل غافل بھی۔وہ کچھ دیر تک اس کے انہماک کو ستائشی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر جا کر گودام میں پڑی میز کے پیچھے بیٹھ گئی۔وہ اسے یکسر فراموش کر چکا تھا۔وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی مگر ماہر کا انہماک نہ ٹوٹا۔وہ مختلف زاویوں اور انداز سے کتابیں دیکھتا اور چھانٹتا رہا۔گودام کے محافظ کو اشارہ کرتے ہوئے وہ اپنے چیمبر میں واپس آگئی۔

اس نے دوپہر کا کھانا کھانا چاہا مگر ماہر کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔وہ سمجھ گئی یا تو وہ پکا بیوپاری تھا یا پھر کتابوں کا عاشق۔اس نے کچھ اسنیکس اور چائے اس کے لئے بھجوائی اور اپنے کام میں لگ گئی۔

گودام کیپر کے ساتھ وہ کتابوں کی خاصی کثیر تعداد کے ساتھ لوٹا تھا۔اس کا سیاہ سوٹ کافی جگہ سے گرد آلود ہو رہا تھا۔اسے دیکھ کر ایک بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی اور ماہر کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

وہ کافی دیر تک رائلٹی اور حقوق پر بات کرتے رہے۔پھر ان کی ڈیل مکمل ہوگئی۔وہ دستاویزات تیار کروانے کا کہہ کر نکل گیا۔جاتے وقت وہ کافی مطمئن لگا۔سارہ کو پہلے لگا وہ اس سے ملنے آیا تھا مگر ماہر کو یوں مطمئن جاتے دیکھ کر اُسے لگا جیسے کوئی بزنس مین رخصت ہوا ہو۔وہ اس کی شخصیت کے دو متضاد پہلوؤں پر غور کرتی رہ گئی۔وہ اگلے تین روز تک ملتے رہے اور کاغذات و ڈیل مکمل ہونے تک ساتھ رہے۔ان کی شام کسی ہوٹل، سمندر کے کنارے یا کسی سکائی اسکریپر پر گزرتی۔

تین دنوں نے زندگی بدل دی۔وہ بھول گئی کہ وہ عمر کا چالیسواں سال پار کر چکی ہے اور بیوہ ہے۔

وہ وہی سارہ بن گئی جو یونیورسٹی میں قلانچیں بھرتی تھی جس نے اپنی تعلیم کے مکمل ہوتے ہی ملائشیا کے سفارت خانے میں ترجمہ نگاری کی نوکری کر لی تھی، کیونکہ اسے کئی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔

اسی سفارت خانے میں وہ عبداللہ بن ٹیانگ سے ملی تھی، جو پہلے سے شادی شدہ تھا، ملائی بیوی رکھتا تھا اور بچے بھی تھے۔ اس کے پاپا کی اچانک موت نے اسے تنہا کر دیا تھا۔ کب عبداللہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں داخل ہوا، اسے پتہ نہیں چلا۔ عبداللہ اپنی ملازمت کی معیاد ختم ہونے پر ملائشیا روانہ ہونے لگا تو وہ اس کے ساتھ ہولی۔ اس ملک میں اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔ اس کی ماں جرمن نژاد یہودن تھی، ایک آزاد خیال عورت جبکہ پاپا مسلمان۔ اس کی پیدائش کے بعد دونوں کے جھگڑوں نے ان کو علیحدہ کر دیا۔ پاپا اسے لے کر اپنے ملک چلے آئے اور خاندان والوں نے اسے یہودن کی بیٹی ہونے کی وجہ سے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ پاپا کی مسلمان بیٹی ہو کر بھی ان کے لئے اجنبی اور غیر ہی رہی۔ پاپا کی موت کے وقت اس نے کچھ رشتہ داروں کو دیکھا تو تھا جو بعد میں پلٹ کر کبھی نہیں آئے تھے۔ وہ کس کے لئے وہاں رکتی؟ دل کے رشتے، ملکی، قومی اور لسانی وتہذیبی رشتوں پر بھاری پڑ گئے تھے۔ چنانچہ نکاح کر کے عبداللہ کے ساتھ جانا اس کی مجبوری والی خوشی بن گئی۔ اس کے اپنے ملک میں اس سے محبت کے نام پر فلرٹ کرنے کو ہر کوئی تیار تھا مگر نکاح کر کے بیوی بنانے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔ جرمن نژاد ماں کی بیٹی جو تھی۔

اس نے سوچا عبداللہ کے ساتھ جا کر وہ وہاں اپنا خاندان آباد کرے گی، جہاں اس کا ماضی اور اس کے والدین کی غلطی کی کہانی دہرانے والا کوئی نہ تھا۔

عبداللہ نے اس کو بیوی ہونے کے تمام حقوق تو دیئے مگر اس کی ماں بننے کی خواہش کبھی پوری نہ ہونے دی۔ اچانک عبداللہ کا انتقال ہو گیا مگر مرنے سے پہلے وہ اس کے لئے روزگار، گھر اور دیگر ضروریات کا انتظام کر گیا تھا۔ اب دنیا خالی تھی۔ وہ ہمیشہ سوچتی اگر ایک اولاد ہو جاتی تو کتنا اچھا ہوتا مگر سب کو مکمل زندگی کب اور کہاں ملتی ہے؟ وہ اکثر سوچتی کہ شاید اس میں ہی کوئی خامی ہوگی! مگر اسے ہمیشہ یہ بھی یاد رہتا کہ عبداللہ نے ہمیشہ یہ احتیاط برتی تھی کہ اسے اولاد نہ ہو۔ یہ واقعتاً اس پر ظلم تھا۔ یہ ظلم کیا اس پر اس لئے تھا کہ وہ ایک جرمن یہودی ماں اور ایشیائی مسلمان باپ کی بیٹی تھی؟ جو اسے جنم دیتے وقت اپنا مذہب اور ملک بھول گئے تھے؟ باپ تو مسلمان تھا وہ بھی مسلمان تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ عورت تھی جو اولاد جَن کر مکمل ہونا چاہتی تھی.... مگر اسے ادھورا ہی رہنے دیا گیا۔ عبداللہ کی موت کے بعد اس نے اس کی اولاد سے قریب ہونے کی کوشش بھی کی،

مگر عبداللہ کی پہلی بیوی نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ اب بھی عبداللہ کا بڑا بیٹا، جو اس اشاعتی کمپنی کا مالک تھا وہ بزنس مین اور باس کے لہجہ میں بات کرتا تھا۔ اس نے تو کیا عبداللہ کے کسی بچے نے بھی اسے ماں کا درجہ کبھی نہیں دیا تھا۔ جب وہ باہر گھوم رہے تھے تو وہ یہ سب باتیں اور احساسات ماہر کو سناتی رہی۔

وہ اس کے قیام کا آخری دن تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ تاکہ وہ اکٹھے ڈنر کر سکیں۔

وہ کچن میں جب تک کھانا بناتی رہی وہ اس کی لائبریری میں موجود کتابیں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی بلند آواز میں وہ اس سے مخاطب ہو لیتا اور کسی کتاب سے متعلق سوال پوچھ لیتا۔ کھانا انھوں نے ایک عجیب سی خاموشی کے بیچ ختم کیا۔ کافی کے وقت وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ اچانک کافی کا مگ ٹیبل پر رکھ کر وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس کے گھٹنوں پر آہستہ اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''وِل یو میری می؟''

وہ ایک پل کے لئے گڑبڑا گئی۔ پھر بڑی ہمت جمع کر کے اس نے کہا:

''شیل وی ہیو چلڈرن؟''

اب گڑبڑانے کی باری ماہر کی تھی۔ اس نے تھوڑا توقف کیا اور ہکلاتے ہوئے کہا؛

''شاید نہیں۔''

''تو میں پھر سے دوسری بیوی نہیں بننا چاہتی اور نہ پھر سے ہجرت ہی کرنا چاہتی ہوں۔ میں ہجرتوں سے تھک چکی ہوں۔''

اس نے رسان سے جواب دیا اور اپنا کافی کا مگ لئے وہاں سے اٹھ گئی۔

ایئرپورٹ پر الوداعی منظر تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہاتھوں میں بزنس ڈیل کی فائل۔

سارا کے چہرے پر متانت، رسان اور سنجیدگی تھی مگر جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا، وہ بلک پڑی، اسے لگا اس کا دل ماہر کے قدموں سے لپٹ کر پلین میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ وہ بے جان سی ہو کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی۔

دہشت گرد

اُس کے پیروں کی بیڑیوں کی کھنکھناہٹ بڑی ڈراؤنی تھی۔
امتحان ہال کے در و بام پر گونجتی، ہال میں موجود سو آنکھیں بیک وقت اس کی طرف اُٹھیں۔خوف! دہشت! تعجب! ترحم! حقارت! غصہ! حسرت! سوال! کیا نہ تھا؟ ہر آنکھ میں الگ الگ جذبات تھے!
ہاں سب وہی تھے۔اُس کے اپنے ساتھی! چار سال پہلے والے! جن کے ساتھ وہ پڑھا کرتا تھا۔ایم۔بی۔بی۔ایس۔کے پہلے سال میں!
صوبے میں اوّل آنے والا لڑکا جس کا میڈیکل رینکنگ نمبر ایک تھا اور جس نے اپنے شہر کی میڈیکل کالج کی پہلی سیٹ پہلے دن پہلی گھڑی میں لی تھی۔
C۔E۔T۔کاؤنسلنگ سیل میں موجود ہجوم کی ہر آنکھ میں تحسین! احترام! فخر! مبارکباد! خوشی! اور جانے کیا کیا تھا۔جیسے ہی اُس نے کمپیوٹر کا بٹن دبایا وہ میڈیکل کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔وہ وہاں جا کر اپنے رب کے سامنے جھک گیا، اُس نے کہا شکر الحمد اللہ!

پہلا سال: اُس نے ٹاپ کیا!
دوسرے سال: وہ اپنی ریاست بھر میں ٹاپ پر تھا!
تیسرا سال: پہلا سمسٹر، اس کی توجہ ہٹی۔
میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں! میرا وجود کیا ہے! کیا میں اسی لئے بنایا گیا ہوں! کہ کمندوں پر کمندیں ڈالوں اور ریکارڈ توڑوں؟
یہ سوال اُسے پریشان کرنے لگے۔مظلوموں کی آہیں اُسے بے چین کرنے لگیں۔
اُس نے ایک اجتماع میں شرکت کرلی۔ڈھیر ساری مذہبی کتابیں لے آیا، اُس نے شرع رکھ لی، لباس بدل گیا اور پیشانی پر چھوٹے سیاہ دھبے نمودار ہوئے۔
چوتھے سال: دوسرے سمسٹر میں قدم رکھتے ہی اُسے گرفتار کرلیا گیا۔میڈیکل ڈین کے بیٹے کو اوّل جو آنا تھا۔اس کی مذہبی کتابیں دہشت گردی کے نام پر ضبط کرلی گئیں۔آج وہ اپنی فائنل ایگزام جیل سے دینے کے لئے آیا تھا۔وہ دہشت گرد تھا۔کیونکہ وہ ''رضی الدین'' تھا اور اُسے تمغے سمیٹنے اور مذہبی ہونے کا بیک وقت حق نہ تھا۔

کٹی پتنگ

میں ایک کٹی پتنگ ہوں۔

میری ڈور، جس سے میں بندھی تھی، ٹوٹ گئی۔

اب میں ہوا میں لہراتی، بل کھاتی، اٹھلاتی، منڈلاتی، بہت خوش ہوں۔

ہوا کے دھیمے جھونکے مجھے جب اُڑاتے ہیں تو بلندیوں کو چھوتی ہوں، بہت مسرور ہوں ایسی اُڑان کس نے بھری ہے آج تک؟

نہ پابندی! نہ روک! نہ ٹوک! بس آزادی ہی آزادی۔

میں کٹی پتنگ ہوں، اپنی بلندیوں پر نازاں! فرحاں! خراماں!

جب میں پہلی بار بنائی گئی، بانس کی تیلی سے اکڑائی گئی، ڈور سے باندھی گئی اور کسی منچلے کے ہاتھوں اُڑائی گئی۔

مجھے اپنے بننے سنورنے اور اکڑنے پر بہت ناز تھا۔ مگر اس منچلے کے ہاتھوں کھینچا جانا مجھے قطعی منظور نہ تھا۔ وہ جب من چاہتا مجھے اُڑاتا۔ جب نہ چاہتا مجھے ڈوری سے لپیٹ کر احترام سے اپنی الماری کے نچلے خانے میں رکھ دیتا۔

مجھے اس طرح نچلی سطح پر رہنا سخت نہ پسند آتا۔ میں ہواؤں کی پلی، اُڑنے پر تلی ہر لمحہ چاہتی کہ بس اُڑتی رہوں! کیا میں نیچے رکھنے کے لئے بنائی گئی ہوں؟ پرسوں اُس نے مجھے اُڑایا تھا۔ مگر اچانک بادل گھر آئے، کالے بادلوں کو دیکھ اُس نے مجھے جلدی اُتارنا چاہا؟ میں نے اُڑنے کے لئے ابھی تو پر کھولے تھے اور وہ مجھے نیچے اُتارنے پر تلا تھا۔

مجھے ضد آگئی، میں نے دیکھا نیچے ایک چھتنار پیڑ تھا۔ میں اُس میں جا چھپی، اُس نے جیسے ہی مجھے کھینچنے کے لئے زور لگایا، میں اس کی ڈور سے آزاد ہوگئی۔ اُس نے ہزار کوشش کی کہ مجھے اُتار سکے، مگر میں ہاتھ نہ آئی۔ مجھے میری آزادی بہت پیاری تھی۔

تھوڑی دیر میں بادل چھٹ گئے، منہ زور ہوا کے جھونکے نے مجھے پیڑ سے بھی آزاد کر دیا۔ یہ لے

میں اُڑ گئی، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد، بغیر بندش، تنہا، آوارہ، من موجی! اٹھلاتی بل کھاتی، مسکراتی ہوا کے دوش پر تیرتی۔ آج کھلے آسمانوں میں تیرتے یہ میرا تیسرا دن ہے۔

میں بلندیوں پر پہنچتے، پہنچتے سورج سے قریب ہو آئی ہوں۔

ارے یہ گرمی کیسی؟ میں جل رہی ہوں! میرا رنگ پھیکا پڑ رہا ہے۔

یہ گرمی یہ تمازت نا قابل برداشت ہے۔

میں نیچے جانا چاہتی ہوں۔ مگر وہ ہوا کہاں ہے جو مجھے اپنی دوش پر لے آئی؟

وہ سبک خرام بادل کہاں ہیں جو مجھ پر سایہ فگن تھے۔

میں نیچے جانا چاہتی ہوں! اُسی چھتنار پیڑ کے پاس، اُسی منچلے کے پاس، جس سے میں بندھی تھی۔

ارے یہ کیا! یہ کون سے گہرے کالے سائے ہیں جو میری طرف بڑھ رہے ہیں؟ مجھے خوف ہے یہ مجھے کھا جائیں گے۔ یہ تیز ٹپ ٹپ کیا ہے۔ میرا نرم کاغذ بھیگ رہا ہے۔ میں پھٹ رہی ہوں، میں پھٹ گئی ہوں، میں بانس کی اکڑی تیلی سے لٹک کر خود کو سمیٹ رہی ہوں مگر میری اکڑی تیلی بھی ٹوٹ گئی۔ میں دھڑام سے نیچے آئی۔ یہ گرنا میرا ہی تھا۔ کسی کو محسوس ہی نہ ہوا۔ ٹوٹی میں ہی تھی۔ چیخا کوئی نہ تھا۔ میری صدائے ریخت بے آواز تھی۔ پانی کا ریلا مجھے بہا لے گیا اور میں گندے نالے میں خس و خاشاک کے ساتھ بہہ رہی ہوں۔

اے کاش کہ میں اپنی ڈور سے بندھی ہوتی۔

اے کاش کہ میں نے بے حساب اُڑنے کی ضد نہ کی ہوتی۔

اے کاش کہ وہ منچلا مجھے حاصل کر لیتا اور مجھے اپنی الماری کے نچلے حصے میں سہی احترام سے رکھ لیتا۔

اے کاش میرے وجود کا کوئی محافظ و سائبان ہوتا!

اے کاش میں کٹی پتنگ نہ ہوتی!

کسی ڈور سے بندھی ہوتی!

اے کاش میں کٹی پتنگ نہ ہوتی!

ٹوٹتی سرحدیں

وہ بڑے انہماک سے لڑکوں کو پڑھا رہا تھا کوٹ کی جیب میں رکھے مسلسل فون کی بزنگ نے اس کے انہماک کو توڑ دیا۔ اس کی آرمی اکیڈمی کے اوقات سب کو معلوم تھے۔ کوئی بھی کال نہ کرتا۔ مگر یہ مسلسل لرزش بے معنی نہ تھی۔ وہ ''ایکسکیوزمی'' کہتا ہوا باہر آیا۔

ڈاکٹر سیّد احمد کی کال تھی۔ ''ہیلو الطاف امّاں بے ہوش ہوگئی ہیں۔ کیا تم آسکتے ہو؟'' ان کی مضطرب آواز اس کے کانوں میں سیسہ بن کر اترتی۔ ''کیا ہوا'' اس نے استفسار کیا۔ ''پتہ نہیں عصر کے لئے بستر سے اٹھ رہی تھیں کہ گر پڑیں۔ تب سے بے ہوش ہیں۔ میں کیا کروں اپنی تمام کوششیں کر چکا۔ آنکھیں نہیں کھول رہی ہیں۔'' ڈاکٹر احمد فزکس میں ڈاکٹریٹ تھے۔ مگر سب انھیں ڈاکٹر سید احمد ہی کہتے۔ ان کا حلیہ ہی کچھ ایسا تھا۔

''امّاں کو ملٹری اسپتال تک لے آئیے، میں اپنی کلاس ختم کرتے ہی پہنچ جاتا ہوں۔'' فون بند کیا، پلٹا اپنی کلاس میں داخل ہوا اور موضوع کو وہیں سے شروع کیا جہاں چھوڑا تھا۔ ملٹری والوں کے یہاں ''ایمرجنسی'' کے معنی دوسرے تھے۔ انسانی جان نہیں۔ ان کی ڈیوٹی ہی ان کا سب کچھ ہوتی ہے۔ چاہے کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہی کیوں نہ ہو۔

پڑھانے میں اس مرتبہ انہماک نہ تھا۔ ہمہ تن گوش طلباء اس کی بے چینی محسوس کرنے لگے۔ جیسے ہی کلاس ختم ہوئی وہ کیمپس میں کھڑی گاڑی کی طرف لپکا۔

امّاں کے علاوہ اس کا اس پردیس میں کوئی نہ تھا۔ ابا چل بسے تو سات سمندر پار وہ اپنی امّاں کو لے آیا تھا۔ ایرونا ٹک انجینئرنگ کے ماسٹرس کے آخری سال کیمپس سلیکشن کے دوران اسے ابوظہبی فوج کے لئے پائلٹ کی حیثیت سے چن لیا گیا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ ہندوستان کے دور دراز قریئے میں پڑھانے والے ایک اسکول ماسٹر کا بیٹا، ابوظہبی کی فوج میں کیپٹن کی حیثیت سے تعینات ہوا تھا۔ مگر یہ آسان بھی نہ تھا۔ دو سال کے تربیتی وقفے کے دوران وہ کسی بھی طرح ہندوستان واپس نہیں آسکتا تھا۔ امّاں ابا نے دل پر پتھر رکھ کر اجازت دی، حالانکہ اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بہنوں کے بعد منتوں مرادوں سے پیدا ہوا، مگر ابا اس کی ترقی میں کسی بھی طرح کی روکاوٹ نہیں بننا چاہتے تھے۔ ابا کو اپنی مفلسی بہت پیاری

تھی۔اس سے پہلے کہ فراغت آتی اور بیٹا گھر لوٹتا، ابّا نے رخصت لی، اور اللہ سے جا ملے، جیسے تیسے اس نے دو بہنوں کی ذمہ داری ادا کی، بیک وقت شادیاں کرادیں، اور جب بہنیں اپنے گھروں کی ہوگئیں تو وہ امّاں کو اپنے ساتھ لے آیا۔

اس کا مکان فوجی بیرکوں سے بہتر تھا۔کیونکہ وہ تین تھے۔اس لئے دوکمروں والا چھوٹا سا مکان فوج کی جانب سے انھیں دے دیا گیا تھا۔ایک ہندوستانی، ایک پاکستانی اور ایک بنگلہ دیشی، تینوں الگ الگ دیسوں سے تھے مگر چونکہ مسلمان تھے اس لئے پردیس میں ساتھ تھے۔

اس کی ہوائی اُڑانوں کے بعد جب بھی اسے فرصت ملتی تو اس کے لئے حکم تھا کہ وہ ابوظہبی انجنیئرنگ کالج کے طلباء کو پڑھائے، ہفتے میں چار دن کی ہوائی اڑانوں کی مشق کے بعد ہر پانچویں دن اس کی کلاس ہوتی۔آج کی اسی ڈیوٹی کے دوران ڈاکٹر سید احمد کی کال آئی تھی۔

اس کی گاڑی ملٹری ہسپتال کے احاطے میں داخل ہوئی تو وہ ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔تیزی سے ریسپشن کی طرف بڑھا، کوریڈور میں ٹہلتے مضطرب ڈاکٹر احمد اس کی طرف تیزی سے بڑھے۔''امّاں کہاں ہیں؟''اس کی کھوجتی نظروں نے سوال کیا۔''ICU میں ہیں، دعا کرو، شاید ان پر دل کا دورہ پڑا ہے۔''ڈاکٹر احمد نے وضاحت کی۔''وہ ٹھیک تو ہو جائیں گی نا؟ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ ان کے علاوہ اس پردیس میں میرا کوئی نہیں.... میری اماں!!!''

ڈاکٹر سید احمد کے کندھے پر سر لگائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔اور احمد اس کی پیٹھ تھپتھپا کر تسلی دیتے رہے۔

''الطاف خود پر قابو رکھو، وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔تمہاری ہی نہیں وہ ہم سب کی امّاں ہیں۔''

امّاں سب کی امّاں تھی، بنگلہ دیشی ناصر کی بھی، پاکستانی ظفر کی بھی اور پڑوسی سید احمد کی بھی۔جب دو فلائٹ پر جاتے تو تیسرا امّاں کی دیکھ بھال کرتا۔جب تینوں باہر ہوتے تو ڈاکٹر سید احمد اماں کی تنہائی دور کرنے آجاتے۔

رات ہوتے ہوتے امّاں کے تینوں بیٹے جمع ہوگئے، سب کی آنکھیں نم، آواز بھرائی اور ہاتھ جڑے ہوئے۔وہ نادانستہ ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے تھے۔امّاں سے بچھڑنے کا ڈر اور تنہائی کا خوف ان پر سوار تھا۔''تینوں کے دل بے اختیار پکار اٹھے،''اللہ ہماری امّاں کو ٹھیک کر دے!''

امّاں کے ٹھیک ہونے میں پندرہ دن لگے۔ باری باری ہر بیٹے نے ان کی خدمت اور نگرانی کی۔ ایک سوتا تو دوسرا جاگتا، تیسرا کھانا لے آتا، ایک اڑان بھرتا تو دوسرا گھر صاف کرتا اور ضروری چیزیں لے آتا اور تیسرا امّاں کی نگہداشت کرتا۔ پندرہ دن پہاڑ کی طرح گزرے۔ دھیمی سرکتی سرد راتیں، خوف کے بے چین منڈلاتے سائے اور تین تنہا امّاں کے بیٹے۔

پہلی بار امّاں نے جب گھر میں قدم رکھا تھا، گھر کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ یہ تینوں لونڈے گھر کو کباڑ خانہ بنائے رکھتے، امّاں سب کو ڈانٹتی، ڈپٹتی، کپڑے سمیٹتی گھر کو صاف کرتی رہتیں۔ کھانا بنانا، تینوں میں سے جب بھی کوئی گھر آتا، اسے کھانا پروسنا، سب کے کپڑے باری باری واشنگ مشین میں ڈالنا، نکال کر سُکھانا، گھر کو صاف ستھرا رکھنا، حتیٰ کہ کبھی کبھی حمام اور بیت الخلاء بھی صاف کرنے کو تیار ہو جاتیں، تب کہیں تینوں کو شرم آتی اور کوئی ایک اندر گھس جاتا۔ جب سے امّاں آئیں تھیں تینوں کے تو عیش ہو گئے تھے۔ ظفر کی جب چھُٹی آئی تو پاکستان ہو آیا۔ آتے وقت امّاں کے لئے ڈھیر سارے شلوار سوٹ لے آیا۔ ناصر کی باری آئی تو بنگلہ دیش چلا گیا، آتے آتے امّاں کے لئے ململ کی ساڑیاں لے آیا۔ الطاف نے ابوظہبی میں ڈیرے جما لئے، کس کے لئے جاتا؟ بہنیں اپنے گھر کی، خود اس کا آبائی گھر بوسیدہ ہو رہا تھا۔ اس کی کُل کائنات امّاں ہی تھیں جو اس کے پاس تھیں۔ امّاں تینوں سے کہتیں ''ارے کوئی تو شادی کرلو اور بہو لے آؤ'' سب ایک آواز میں کہتے۔

امّاں ہم تینوں بھائی بچھڑ جائیں گے.... اور آپ دُشمن بن جائیں گی، ہمیں ایسے ہی رہنے دو۔''

پانچ سال پر لگا کر اُڑ گئے کسی کو بھی نہ لگا کہ وہ پردیس میں بے گھر اور اپنوں سے دور ہیں۔ ان کو کبھی یہ یاد نہ رہا کہ ایک ہندوستانی، دوسرا پاکستانی اور تیسرا بنگلہ دیشی ہے۔ ٹی وی پر خبریں دیکھتے جب ایک ملک اپنے ملک کے اندر ہونے والے دھماکے کا ذمہ دار دوسرے پڑوسی ملک کو ٹھہراتا تو سب ہنس پڑتے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مار کر اپنے اپنے ملکوں کے سیاستدانوں کی خوب کھلی اڑاتے کہ کس طرح وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے ایک دوسرے کو اپنا دشمن بنا رہے ہیں اور اپنے اپنے ملک کے عوام کو اُلو بنا رہے ہیں۔ دوسری طرف امّاں کھانا بناتی، کپڑے سینتتی، پردے سرکاتی، ان کو نہارتی سوچتیں ''یہ سرحدیں ٹوٹتی کیوں نہیں؟'' پر اب ان کے سروں کا سائبان امّاں خود ڈھے گئی تھیں۔ پندرہ دن کی تھکان، انتظار اور ہسپتال کے پے در پے چکروں کے بعد آخر وہ امّاں کو گھر لے آئے۔ اُمید بس یہی تھی کہ امّاں پھر سے کھڑی ہو جائیں، سب کو سمیٹنے کے لئے۔ مگر امّاں کو ایک چپی سی لگ گئی تھی۔ ان کی ڈانٹ، ڈپٹ، پکار، آوازیں سننے کو تینوں کے کان ترس

گئے، ہر کوئی اپنی کوشش بھر دلجمعی کرتا کہ امّاں مسکرادیں، مگر امّاں کی مسکراہٹ میں چھپا درد ان سے چھپا نہ رہ سکا۔ امّاں کے پھیپھڑوں میں بلغم بھر گیا تھا۔ خطرناک قسم کے نمونیا، پھیپھڑوں میں بھرے بلغم کے وزن سے دل کمزور پڑ گیا اور رکنے لگا تھا۔ بروقت ڈاکٹر سید احمد اسپتال نہ پہنچاتے تو شاید وہ دم آخری ہوتا۔

آخرکار امّاں کی چپی ٹوٹی ''مجھے انڈیا جانا ہے۔''

''کیا؟'' تینوں بیک وقت پکار اٹھے۔ ڈاکٹر سید احمد کے سنجیدہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

''ہاں مجھے انڈیا جانا ہے، اگر میں مر گئی تو مجھے کہاں دفن کرو گے؟ یہاں پردیس میں؟'' امّاں کا خوف اُبھر کر آیا۔ ''نہیں امّاں مریں آپ کے دشمن آپ کیوں مریں گی؟ ہم سب کی عمر آپ کو لگے۔'' تینوں کی آواز بھرا گئی اور وہ خود ایک دوسرے کے سراسیمہ چہرے دیکھنے لگے۔

''دیکھو اگر میں یہاں رہی تو تم کبھی شادیاں نہیں کرو گے، یوں ہی لنڈورے گھومتے رہو گے، مجھے پردیس میں نہیں مرنا۔ مجھے انڈیا جانا ہے، تمہارے ابا کے بازو میں دفن ہونا ہے۔'' ان کی آنکھیں جھک گئیں، وہ سب سمجھ گئے کہ امّاں کا خوف کیا تھا۔ انڈیا میں آپا سے بات ہوئی، آپا امّاں کو سنبھالنے اور استقبال کرنے کو تیار ہو گئیں۔ الطاف انھیں چھوڑنے انڈیا جا رہا تھا۔ ایئرپورٹ پر سب چھوٹے بچوں کی طرح بلک رہے تھے۔ امّاں سے جدا ہونا انھیں قطعی منظور نہ تھا۔

مگر اماں چلی گئیں، اپنے ساتھ ساری رونقیں بھی سمیٹ لے گئیں۔ ابوظہبی کی تمام رنگینوں کے باوجود یہ چمکتا شہر ان کے لئے ویران ہو گیا۔ الطاف اپنی چھٹیاں ختم کر کے لوٹ آیا، اکیلا جیسے کسی کو دفنا آیا ہو۔ پردیس کے دن پرائے اور راتیں بھاری ہو گئیں، وہی گھر تھا وہی کمرے، وہی پردے اور وہی کچن مگر امّاں نہ تھیں، ایک دوسرے سے آنکھیں چرا کر وہ اپنی آنکھیں پونچھ لیا کرتے۔ دن سرکتے گئے۔ الطاف دوسرے دورے پر بیوی لے آیا۔ امّاں اسے اکیلا بھیجنے پر قطعی راضی نہ تھیں، ناصر اور ظفر گھر خالی کرنے کو تیار تھے، مگر الطاف نے خود سے گھر الگ کر لیا۔ اگلے سال ناصر اپنی بیوی لے آیا پھر ظفر بھی۔ کبھی کبھی وہ ملتے، امّاں کو یاد کرتے، جب بھی ملتے انڈیا کال ملاتے.... امّاں سے گھنٹوں نہیں صرف منٹوں بات کر پاتے کہ فون کٹ جاتا باتیں ختم نہ ہوتیں۔

عمر کے بیالیس سال کس طرح بیتے کسی کو یاد نہ رہا۔ فوج سے وظیفہ یابی کا پرچہ دیکھ کر وہ تینوں چونک گئے۔

''کیا پھر وقتِ ہجرت ہے؟'' نئی نوکریوں کی تلاش، فکرِ معاش، بیوی بچوں کو پالنے کا خوف ذمہ داریاں، ان

کے چہروں کی لکیریں گہری ہوگئیں۔ بالوں میں سفیدی در آئی۔ الطاف نے شارجہ یونیورسٹی میں خود کو ضم کروالیا ظفر کو کناڈا میں ملازمت مل گئی اور ناصر انگلینڈ جا بسا۔ تینوں ایک دوسرے کے لئے پرائے ہوگئے۔

وہ اتوار کی سست صبح تھی جب ظفر کے فون کی گھنٹی بجی۔ ''ابے کہاں ہے ابھی سویا ہے کیا؟'' الطاف کی آواز تھی۔ ''اٹھ اپنا نیٹ آن کر، امّاں تجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

''کیا؟ امّاں اور نیٹ پر؟ امّاں نیٹ پر ہیں!''

وہ امّاں کو اپنے کمپیوٹر پر دیکھ کر رو پڑا۔ ''امّاں آپ!'' اس کے لب کپکپائے۔

امّاں کے چہرے کی جھریوں میں زمانے بھر کی شفقت سمٹ آئی تھی۔ برسوں پہلے پردیس میں اس کے سر پر شفقت سے پھیرے گئے ہاتھ کا لمس اچانک یاد آ گیا۔

''کیوں اپنے بچوں کو نہیں دکھائے گا کیا؟ تیری بیوی کہاں ہے؟'' وہ باری باری اپنے سوتے بچوں کو اٹھا لے آیا۔ ''امّاں یہ تحسین اور یہ توصیف''۔ باتیں تھیں کہ ختم نہ ہوتیں۔

اب ہر اتوار کی صبح ظفر کی باری ہوتی تو شام ناصر کی۔ جمعہ کا دن الطاف کے لئے مختص تھا۔ ڈاکٹر سید احمد سے کبھی کبھی بات ہو پاتی۔ وہ اپنی بیوی کے انتقال کے بعد پاکستان کے ہوگئے، بچوں کی ذمہ داریاں جو تھیں۔ آج آپا جب گھر سے آفس کے لئے نکلیں تو انھوں نے ڈاکٹر سید احمد کو کمپیوٹر کے اسکرین پر دیکھا۔ وہ بہت تھکے تھکے لگ رہے تھے، ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے کندھوں کو جھکا دیا تھا۔ وہ امّاں کو پاکستان بلا رہے تھے۔ ''امّاں بیٹی کی شادی ہے اور آپ کو پاکستان ضرور آنا ہے''۔

''مبارک ہو بیٹا، پہلے ان سرحدوں کو کھلوا دو تو شاید آپاؤں، ہاں مگر اپنی بیٹی کی شادی اس جادوئی ڈبّے پر ضرور دکھا دینا۔'' اور آپا اپنی نم آنکھوں کو پونچھتی چپ چاپ باہر نکل گئیں۔

وہ سوچ رہی تھیں۔!!!

''سرحدیں کہاں ہیں؟''

استاد

''تمہارا نشانہ بہت پکّا ہے۔کہاں سے سیکھا؟ تمہارا اُستاد کون ہے؟''

زمانۂ قدیم کا ایک رشی سولہ سالہ ایک لڑکے سے پوچھ رہا تھا، جو تیر اندازی کی مشق میں مشغول تھا۔

''میرا کوئی اُستاد نہیں؟کسی نے مجھے نہیں سکھایا، یہ بس میں نے خود کی مشق سے سیکھا ہے''لڑکے نے غرور سے جواب دیا۔

''کیا کسی نے بھی نہیں سکھایا؟ سوچو ذہن پر زور دو شاید تم نے کبھی کسی کو دیکھا ہو اور بعد میں مشق شروع کی ہو''۔رشی نے تفصیل دریافت کی۔

''قطعی نہیں! میں نے ایسا کرتے کسی کو دیکھا ہے نہ کسی سے سیکھا۔یہ ہنر میرا اپنا ایجاد کردہ ہے''لڑکا اپنی بات پر قائم رہا جس میں غرور و اعتماد کا مشترک شائبہ موجود تھا۔

''میں آخری بار پوچھ رہا ہوں'' تمہاری تحریک کا منبع کیا ہے؟'' رشی کی آواز میں ہلکی سی درشتی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم میں نے کس کو دیکھا تھا''لڑکے کی آواز لڑکھڑائی۔

''چلو ٹھیک ہے اب تیر چلاؤ''رشی نے لڑکے کا کندھا تھپتھپایا۔

لڑکے کا تیر اندازی کا نمونہ جُداگانہ تھا۔وہ آسمان کی طرف تیر مارتا، ایک مخصوص دوری پر جا کر تیر ایک مخصوص زاوئیے سے مُڑ کر زمین کی طرف آتا۔اس سے پہلے کہ تیر زمین سے جا لگے لڑکا تیزی سے لپکتا اور تیر کو اپنے ہونٹوں سے پکڑ لیتا۔لڑکے کے اسی فن نے، گزرتے رشی کے قدم روک لئے تھے۔

''لڑکے نے نشانہ سادھا، کمان پر چڑھے تیر کو اپنے ماتھے سے لگایا۔کمان تان کر تیر کو چھوڑ دیا۔اس سے پہلے کہ تیر بل کھا کر زمین پر آتا لڑکا تیزی سے دوڑا۔

''ارے یہ کیا تمہارے منہ سے تو خون نکل رہا ہے....زخمی ہو گئے؟''

رشی لڑکے کے پاس دوڑا۔پانی سے منہ دھلوایا اور اپنے کندھے پر پڑی چادر لڑکے کی طرف بڑھائی۔''یہ لو منہ پونچھ لو''۔

شرمندگی اور شکست لڑکے کے چہرے سے مترشح تھی۔

''دیکھو اب بھی یاد کرو، انسان نہ سہی کسی جانور یا پرندے کو تم نے ایسا کرتے دیکھا ہو؟'' رِشی کی آواز میں ہمدردی اور تاکید واضح تھی۔

''ہاں یاد آیا میں نے ایک پرندے کو دیکھ کر یہ سیکھا ہے۔ سطحِ آب پر وہ ساکن ٹھہرتا۔ جھپک کر مچھلی کا شکار کرتا۔ پھر مچھلی کو لے اُڑتا۔ ہوا میں جا کر مچھلی کو وہ چونچ سے چھوڑ دیتا۔ اس سے پہلے کہ مچھلی پانی تک آئے، وہ واپس سطحِ آب تک تیزی سے آتا اور پلٹ کر واپس مچھلی کو اپنی چونچ کی گرفت میں لے لیتا۔ یہ فن میں نے اُسی کو دیکھ دیکھ کر سیکھا ہے۔ شاید وہی میرا اُستاد ہے۔''

''شاباش، بہت خوب.... چلو دیکھیں تو! دوبارہ تیر اُٹھاؤ''۔ اُستاد نے اس کی پیٹھ دھیرے سے تھپ تھپائی۔ اس نے اپنا نگوں سر اُٹھایا، یاس اور شکست خوردہ نظریں، دعائیں دیتی آنکھوں سے ملیں۔ اعتماد نے سر اُٹھایا۔ دھیمے قدموں سے تیر کی طرف بڑھا، کمان کھینچ کر تیر چھوڑ دیا۔ قبل اس کے کہ تیر زمین پر آتا، لڑکے نے پوری مہارت کے ساتھ اپنے ہونٹوں پر تھام لیا اور فتح کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''اُستاد کی نظرِ کرم علم کو مکمل کرتی ہے'' کہتا ہوا رشی اپنی راہ چل دیا۔

ماخذ: ''کنڑی لوک کتھا''

کچا گوشت

''نعم بھاگو! وہ آرہی ہے''۔میری چیخ نے سب کو چوکنا کر دیا۔
''سکینہ! تو بھی نا بے کار میں ڈراتی ہے''۔رحیم اپنی بے قابو پھولتی سانسوں کے درمیان چلایا۔
''اے بندریا تو دوبارہ چیخے گی تو سب سے پہلے مجھ سے پٹے گی'' شبیر نے دھاڑ ماری۔''جھوٹی کہاں ہے؟''
سلیم نے اس کی چٹیا کھینچ ہی لی۔
''ارے سورو۔وہ چھم چھم کی دور سے آتی آواز سنو! وہ اور قریب آرہی ہے''۔
''ارے ہاں، سچی! آواز تو آرہی ہے، چلو جو ملا ٹھیک کل علی الصبح آئیں گے۔اب خیر مناؤ۔ورنہ یہ چھلکے بھی گئے ہاتھ سے''۔

وہ سب کے سب بیک وقت بول پڑے اور جلدی جلدی اپنے گٹھے سمیٹ کر ہتھ گاڑی پر رکھے۔''چل بندریا تو بیٹھ جلدی سے''۔شبیر حسب معمول چلایا۔وہ شان بے نیازی سے چھلکوں پر بیٹھ گئی۔تین پیچھے سے دھکیلتے اور دو سامنے سے باری باری کھینچتے،یوں وہ دھیرے دھیرے ڈپو کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔
انھیں یقین تھا کہ وہ گیٹ پر نہیں ہوگی، اندر پہرہ دینے گئی ہوگی اور وہ نکل لیں گے۔مگر شاید اس نے دیکھ لیا تھا....وہ وہیں سے چلائی ''ارے ٹھہرو شیطانو! جاتے کہاں ہو''۔مگر شیطان کہاں رکنے والے تھے،اس سے پہلے کہ وہ پہنچتی،یہ جا وہ جا۔

وہ سب کے سب فارسٹ گارڈ علاقے کے مزدوروں کے بچے تھے یہ ان کا ہر جمعہ یا تعطیل کا معمول تھا کہ فاریسٹ ڈپو کے اندر جاتے،جنگل کی کٹائی سے پڑے شہتیروں کے چھلکے اتارتے،اپنے اپنے گٹھے باندھتے۔ان سبھوں کی مشترکہ تیار کردہ ایک ہاتھ گاڑی تھی جس پر وہ اپنے گٹھے رکھتے اور سکینہ واحد ہستی تھی جو اس پر بیٹھتی اور سب اسے باری باری کھینچ کر بستی میں لے آتے۔سارے لڑکوں کی ٹولی کے بیچ وہ واحد لڑکی تھی جو اس بہادرانہ کام میں ان کا ساتھ دیتی،ایک تو چھوٹی تھی،دوسرے سوتیلی ماں کی پروردہ تھی جس کو قطعی فکر نہ تھی کہ اس کی بیٹی کہاں جاتی ہے اور کیا کرتی ہے۔بابا کو ویسے بھی کہاں ہوش رہتا،وہ تو ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔اسے جوان بیوی تک کی خبر نہ رہتی تھی،بیٹی کی کہاں سے رکھتا۔یوں وہ اس دھمال

چوکڑی کا حصہ بن گئی تھی۔لڑکوں کے ساتھ کھیلتی۔کبھی کنچے،کبھی گلی ڈنڈا،کبھی سگریٹ کے جمع شدہ پیک کی تاش تو کبھی تالاب میں تیراکی۔صرف پیٹ کی بھوک اسے گھر تک لاتی یا رات۔اگر نئی ماں کھانا نہ دیتی یا پھر جس دن اس کی پٹائی ہوتی اس دن اس کا کوئی دوست اپنے حصے کا تھوڑا بچا کھانا اسے کھلا دیتا۔

ان دنوں ان کا اسکول بند تھا اور گرمی کی چھٹیاں چل رہی تھیں اس لئے یہ چنڈال چوکڑی تقریباً روزانہ ہی فاریسٹ ڈپو میں جا گھستی،ان کو بارش کے ایندھن کے لئے چھلکے جمع کرنے تھے اور کسی نہ کسی طرح وہ چھلکے لے آتے۔مرد فاریسٹ گارڈ انھیں چھوڑ دیتے تھے کیوں کہ وہ چھلکے ہی لے کر جاتے تھے،لکڑی نہیں اٹھاتے تھے۔مگر جس دن سکّو بائی کی باری ہوتی اس دن ان کی شامت آجاتی۔اس کے ہاتھ لگتے تو چھلکے نکال لیتی یا پھر جو ہاتھ لگتا اس کی پٹائی بھی کر دیتی تھی۔باقی چھلکے لے کر بھاگ نکلتے۔ایک طرح سکو بائی ان کی دشمن بن گئی تھی۔ارے چھلکے ہی لے جاتے ہیں۔مگر یہ ایمانداروں کی سردارن تھی۔خدائی فوجدارن،سارے جنگل کا ٹھیکہ اسی نے لے رکھا تھا،ان کا بس نہ چلتا کہ گالیاں دیتے یا پھر اسے مار ہی ڈالتے مگر کیا کرتے اس کی قد کاٹھی دیکھ کر تو اچھے اچھے مرد ڈر جاتے تھے،وہ تو بس نو نو دس دس سال کے بچے تھے۔

وہ پورے چھ فٹ لمبی تھی۔مرہٹن ماتھے پر بڑا سا تلک اور کچھی مار کر ساڑھی باندھتی،سر پر بڑا سا جوڑا جس میں آبولی کے نارنجی پھولوں کا گجرا ہوتا،ناک میں بڑی سی نتھ اور کان میں بڑے بڑے کرن پھول سرخ سپید رنگت اور وہ ڈھپ کہ دیکھنے والا دیکھتا رہ جائے،مگر ان بچوں کے لئے تو ملک الموت ہی تھی۔اس کا ایک ہاتھ کسی کی پیٹھ پر پڑا تو سمجھو دو دن اٹھا ہی نہیں،کان مروڑے تو لگے کان اکھاڑ ہی لے،آٹھ دن تو کان کی سرخی نہ جاتی اور یہ سارے کوس کوس کر بدعا کرتے،اللہ کرے ناس پیٹی جلدی مر جائے،جنگل کا کوئی سانپ ہی کاٹ لے یا پھر کوئی رات میں چیخنے والا جنگلی بھیڑیا ہی اٹھا لے جائے مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔

وہ ان کا دردِ سر اور مصیبت بنی رہی۔ان کی بدعائیں جاری رہیں حتیٰ کہ ان کے کام اور مشاغل بھی بدل گئے۔

سکو بائی فاریسٹ گارڈ نارائن کی دوسری بیوی تھی۔اس کا پس منظر کیا تھا کسی کو نہیں معلوم تھا بس نارائن کے ساتھ بیاہ کر بستی میں آتے ہوئے ہی لوگوں نے دیکھا تھا۔اس کی کاٹھی اور قد لوگوں کو متوجہ کرتا۔ وہ غضب کی جاذبیت رکھتی تھی مگر کسی معمولی آدمی کے بس کی نہ تھی۔پتہ نہیں نارائن کو کہاں سے مل گئی۔وہ بھی دوسری بیوی کے روپ میں۔بستی میں ہر کوئی چہ مگوئیاں کرتا۔طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوتیں،اٹکلیں

لگائی جاتیں اور اس طرح وہ بستی کا سب سے گرم موضوع بحث بن گئی۔

جہاں غربت اور ضروریات زندگی کے اژدھے منہ پھاڑے کھڑے ہوں وہاں پر گپ شپ عیاشی ہوتی ہے۔ سکوبائی بھی قصہ پارینہ بن گئی۔ لوگوں نے اسے بھی نارائن سے پٹتے روتے بلکتے اور ضروریات زندگی کو ترستے دیکھا تو اپنا ہم جنس قبول کر لیا۔ البتہ بستی کے مرد اسے دیکھ کر آنکھیں ضرور سینک لیتے تھے کہ ایسی مست جوانی انھوں نے کا ہے اور کہاں دیکھی ہوگی۔ کسی بڑے شہر اور بڑے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی تو مس انڈیا کیا مس ورلڈ اور مس گلوب بھی ضرور بن گئی ہوتی۔

بستی کے لئے رفع حاجت کی صرف دو جگہیں تھیں، علی الصبح اٹھ کر جنگل کی راہ لو یا پھر محکمہ جنگلات کی جانب سے تعمیر شدہ عوامی بیت الخلا میں باری لگاؤ۔ زنانے اور مردانے بیت الخلاء الگ تھے۔ بستی کی اگر نئی خبر سننی ہوتی تو وہ یہیں سے نشر ہوتی تھی اور شام تک ساری بستی میں گردش کرتی۔

سکینہ اور اس کے دوست بڑے مزے سے برگد کے نیچے فارغ ہوتے مگر جوں جوں سکینہ بڑی ہونے لگی اس کی ذاتی حیا مانع ہوتی گئی اور اسے بھی جا کر بیت الخلاء کی باری میں ٹھہرنا پڑتا۔ پہلے پہلے تو اس پر یہ بار گراں گزرتا مگر وہاں ہونے والی دلچسپ بات چیت اسے اس کی تکلیف بھلاتی گئی اور وہ اس زندگی کی عادی ہونے لگی۔ دو جگہیں بہت پسندیدہ تھیں: ایک بستی کا وہ واحد سرکاری نلکہ جہاں پینے کا پانی سپلائی ہوتا اور دو یا چار گھڑے پانی کے لئے گھنٹوں کھڑا ہونا پڑتا مگر یہاں بھی بستی کی سارے گھروں کی ساری خبریں مل جاتیں۔ اس لئے دو گھڑے پانی کے لئے چار گھنٹوں کا انتظار مشکل نہ لگتا۔ یہاں کی ہوتی گفتگو، تاڑتی نظریں، کھوجتی گاڑتی نگاہیں، اس کے آتے ہی قطار میں کھڑی عورتوں کی بیک وقت خاموشی، آنکھوں آنکھوں کے اشارے اور پھر کسی اور گھر کی خبر پر بحث، سب کی یک لخت ہنسی۔۔ اسے کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا، وہ بڑی ہو رہی تھی، خاموشی اور جھوٹی ہنسی کو پہچاننے لگی تھی، وہ نگاہوں کی زبان دھیرے دھیرے سمجھنے لگی تھی۔ اسے اپنا گم ہوتا بچپن بے ساختہ یاد آتا جہاں ریاکاری تھی نہ ہنسی کے کئی انداز، کھوجتی نظریں تھیں نہ آنکھوں کے اشارے تھے اور نہ بدلتی نظریں ہی۔

سب کچھ وہاں کتنا سچا اور اچھا تھا۔ صاف روشن نکھرے پانی کی طرح۔ یہاں سب کچھ گدلا گدلا سا کیوں تھا۔

ایک دن اسے لائن میں لگی عورتوں کی یک لخت خاموشی اور بیک وقت مکروہ ہنسی اور ٹٹولتی نظروں کا مطلب اچانک سمجھ میں آ گیا۔ اسے ماہانہ ضرورت کی وجہ سے آدھے دن میں ہی اسکول ختم کر کے گھر آنا پڑا۔

اس کی ٹیچر نے کہا کہ وہ جا کر نہا لے کپڑے بدلے، وہ گھر آئی تو اس کی نئی اماں نے ہڑبڑاہٹ اور عجلت میں ساڑھی باندھتے ہوئے دروازہ کھولا۔ وہ اندر داخل ہوئی تو کپڑے سنبھالتے ہوئے اس شخص کو دیکھا جو کہا جاتا تھا کہ اس کا ماموں ہے۔ معاملہ کنفیوز تو لگا مگر نلکے پر کھڑی عورتوں کے منہ سے کاظم ماموں کا نام، خاموشی اور مکروہ ہنسی نے اس پر سارا پس منظر کھول دیا اور وہ اسی وقت بڑی ہوگئی۔ بہت بڑی تیرہ سال سے تیس سال کی ہوگئی۔ پھر تو وہ ماں اس کی دشمن ہی بن گئی، اس پر کاظم ماموں کی دھمکیاں اور اماں کی قہر آلود نظریں اسے انجانے خوف میں جکڑے رکھتیں۔

نلکے پر اس دن اس نے عجیب خبر سنی۔ نارائن مر گیا ہے۔ نارائن کا مر جانا اتنا عجیب تو نہ تھا کیونکہ پچھلے کئی سالوں سے وہ فالج کی وجہ سے بستر پر تھا جس کی وجہ سے سکو بائی گارڈ کا پہرہ دیتی تھی۔ گھر بھی سنبھالتی، نارائن کی خدمت بھی کرتی اور گارڈ کا کام بھی کرتی۔ بستی میں بہت زور سے چرچا اس وقت ہوئی تھی جب سکو بائی کی ڈیوٹی رات میں لگادی گئی۔ اس نے بڑی سی بانس کی لاٹھی رکھ لی اور بڑے بڑے گھنگرو اس سے باندھ دیئے تھے۔ دن یا رات میں جب بھی وہ جنگل کا یاڈ پپو کا چکر لگاتی اس کی لاٹھی کے زمین پر مارنے کی آواز اور اس کے ساتھ گھنگھرو کی جھن جھنانن جھن کی آوازیں بڑی زور سے گونجتیں۔ لوگوں کو پتہ چلتا کہ سکو بائی حفاظتی راؤنڈ پر ہے۔ دو دن سے لوگوں نے سکو بائی کی لاٹھی اور اس کے گھنگرو کی آواز نہیں سنی تھی۔ نلکے پر اس نے سنا سکو بائی کا پتی نارائن بہت بیمار ہے، پھر تیسرے دن سنا گیا کہ نارائن مر گیا اور سکو بائی بستی سے لاپتہ ہے۔ یہ عجیب معاملہ تھا۔ سکو بائی تو بڑی وفادار تھی۔ کئی سال سے اس نے نارائن کو کبھی نہیں چھوڑا تھا، وہیں پڑی رہتی، اب اچانک اس کا غائب ہو جانا سب کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سب سکو بائی کو برا کہہ رہے تھے۔ شام تک نارائن کی لاش کا سرکار کی طرف سے کریا کرم کر دیا گیا، بستی خاموش اور غمزدہ تھی۔

غریب بستیوں کی خاصیت ہوتی ہے کہ بھلے وہ کیوں نہ کتنی بھی کسی کی چغلی کریں۔ جھگڑیں، کتوں کی طرح بھنبھوڑ لیں، مگر موت کی ٹھنڈک، زندگی کی نمو اور شادی بیاہ کے معاملات میں وہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ نارائن کی موت اور سکو بائی کے غائب ہونے سے بستی پر سکوت طاری تھا۔ سب غمزدہ اور فکر مند تھے۔ پاس گاؤں تک ہرکارے بھی دوڑائے گئے کہ کہیں سکو بائی کی خبر ملے، مگر کوئی خبر نہ آنی تھی نہ آئی۔ پتہ نہیں سکو بائی کو آسمان کھا گیا تھا یا زمین نگل گئی۔

سکینہ کا دکھ گہرا تھا۔سکوبائی اس کی راز دار اور سہیلی تھی۔اچانک ایک دن یوں ہوا تھا کہ چھلکے اتارتے وقت سکوبائی بنا اپنی لاٹھی بجائے وہاں پہنچ گئی تھی۔شبیر،انعم،سلیم،تو ذرا بڑے تھے، بھاگ نکلے مگر رحیم اور سکینہ کو سکوبائی نے پکڑ لیا، گالیاں جو دیں سو الگ، رحیم کا کان مروڑ کر سرخ کر دیا اور اپنے لمبے چوڑے ہاتھ سے دو چار دھموکے بھی جڑ دیئے، رحیم بلبلاتا ہوا بھاگا تھا، وہ سکوبائی کے مارے سے گھبرائی، سمٹی وہیں کھڑی رہی، پھر وہ اس کی طرف مڑی، اب تمہاری سزا یہی ہے کہ تم یہیں رہوگی، سارا دن میرے ساتھ۔ پہلے تو وہ اس کے ساتھ سخت بات کرتی رہی۔اس کے ماں بابا اور سب کے گھر والوں کو گالیاں دیتی رہی، پھر جب دوپہر ہوئی تو وہ اسے اپنے جھونپڑے میں لے گئی اور اسے ایک کونے میں بٹھا دیا، پھر سکینہ نے دیکھا اس نے بڑی تیزی سے سالن بنایا، روٹی بنائی اور چاول بنایا۔نارائن کو کھلایا اس کے کپڑے بدلے صاف ستھرا کر کے اسے واپس سلایا اور ہاتھ دھو کر آئی، پھر سکینہ سے کہا چلو ہم کھاتے ہیں، اب کھانے سے فارغ ہونے تک، دو تنہا انسانوں کے بیچ کا رشتہ گہرا ہو چکا تھا، بنا کسی عہد و پیمان کے اور بنا کچھ کہے سنے۔ وہ شاید ایک دوسرے کا درد سمجھ چکے تھے۔

دوسرے دن کی صبح الگ تھی، گھر سے اسکول کے لئے نکلنے سے پہلے وہ سکوبائی کے گھر ضرور جاتی، اس کی ٹیڑھی میڑھی گندھی چوٹی کھول کر وہ اس کی نئی کنگھی کرتی، اپنے گجرے کے حصے کا آدھا گجرا اس کے سر میں لگاتی اور خوشبو دار صابن سے ہاتھ منہ دھلا کر اسے روٹی کھلا کر اسکول بھیجتی، شام تک اس کا چھلکوں کا گھٹا تیار رہتا جسے لے کر وہ اپنے گھر چلی جاتی، اس کے سر کا گجرا اور کھلتی رنگت دیکھ کر نئی اماں کی زبان غلاظت اگلنا شروع کر دیتی۔شاید یہ خوشی کچھ دنوں کی تھی۔

جس دن اس نے نئی ماں اور کاظم کو ساتھ دیکھ لیا اس دن تو اس کے باپ نے لاتوں گھونسوں پر رکھ لیا تھا، پتہ نہیں نئی اماں نے بابا سے کیا کہہ دیا تھا۔اس کی ماں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کس حال میں گھر لوٹی تھی۔

روتی بسورتی وہ سکوبائی کے گھر ہی گئی تھی، سکوبائی نے اس کے کان میں ازلی منتر پھونکا، اسے نہلایا اور اس کی حفاظت کے طریقے سمجھا دیئے، رات گئے اس کا بابا نشے میں دھت اسے لینے آیا تو سکوبائی کو سنایا گیا کہ وہی اس کی بیٹی کو بگاڑ رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی سکوبائی کی آنکھوں نے اس سے کچھ کہا اور وہ نظریں جھکائے بابا کے ساتھ

گھر چلی گئی۔وقت کے ساتھ یہ رشتہ گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔

آج وہ پھر اکیلی ہوگئی تھی، اس کی سگی ماں کب اور کیوں کر مری تھی اسے معلوم نہ تھا مگر آج سکو بائی کے گم شدہ ہونے پر لگا وہ سچ میں یتیم ہوگئی تھی۔گہری اندھیری رات جس کی کوئی صبح نہ تھی دھیمے دھیمے سرکتی رہی اور اس کی بے سکون پتھرائی آنکھیں، اس کا گندہ میلا تکیہ بھگوتی رہیں۔ پتہ نہیں وہ کب سوگئی۔روتی بسورتی زندگی کھسکتی رہی۔اس نے کسی طرح بستی کے سرکاری اسکول سے میٹرک پاس کرلیا۔

اونچے قد اور کاٹھ کی لڑکی جسے حالات نے وقت سے پہلے بڑا کر دیا ہو بہت بڑی لگنے لگی، پہلی بار شرابی باپ کو لگا بیٹی جوان ہوگئی ہے، کہاں بیاہے۔شام کو شراب میں دھت بڑبڑاتا گھرایا ''خود تو مر گئی، جاتے جاتے یہ بوجھ میرے سر منڈھ گئی، اسے بھی نہ لے گئی اپنے ساتھ'' نئی ماں کے کان کھڑے ہوگئے، شاید اسی انتظار میں تھی۔شام میں بابا پھر جھومتا آیا تو اس نے شاید کچھ کہہ دیا۔

اگلی اتوار اسے دیکھنے کوئی آیا تھا، ساتھ میں کوئی خرانٹ ادھیڑ عمر کی عورت تھی جو شکل سے ہی پان چباتی حرافہ لگ رہی تھی، سکینہ کو دیکھ کر دونوں کی باچھیں کھل گئیں۔''ارے ہمیں کچھ نہیں چاہئے، دو جوڑوں میں لڑکی بیاہ دو بس''۔

رات میں گھر کے پیچھے کاظم ماموں اور نئی اماں کو اس نے کھسر پھسر کرتے دیکھا، شاید کاظم نے نئی اماں کو کچھ دیا تھا جس پر وہ راضی نہیں تھی، پھر اس نے کچھ اور مٹھی میں تھمایا۔اماں اندر آرہی تھی، وہ وہاں سے سرک گئی، اسے کچھ گمان گزرا مگر جتنی سوچ تھی اس سے بڑھ کر کچھ اور سوچ نہ سکی۔آخر کو تجربہ ہی کتنا تھا۔

پہلی بار نئی اماں کی آنکھوں میں اس نے اپنے لئے پسندیدگی دیکھی۔''اری او سکینہ یہ تمہاری اماں کا بکسہ لے لیو اور جو چاہے ساڑیاں نکال لیو کچھ چاندی کا جیور بھی پڑا ہے اسے بھی دھولیو۔سونا تو کھریدنے سے رہے میں شہر جا کر دو چار ساڑیاں اور لے آوٗں''۔نئی اماں کی بے وقت مہربانی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

پندرہ دن بعد قریب کے گاوٗں کے مولوی صاحب نے اس کا نکاح عارف کے ساتھ پڑھا دیا۔بابا کے گلے لگ کر وہ پہلی اور آخری بار رو پڑی اور ایک بوسیدہ سی جیپ میں اماں کے پرانے بکسے کے ساتھ وہ رخصت کر دی گئی۔جیپ میں بیٹھتے وقت بے ساختہ اس کی نگاہ نئی اماں کی جانب اٹھی تھی، جس کے چہرے پر ایک عجیب سی فتح اور سرشاری تھی۔وہ اور کاظم ماموں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے جیسے انھوں نے

کوئی بڑا معرکہ سر کرلیا ہو۔اسے ایک طرف اپنے گاؤں کے چھوٹنے کا غم تھا تو دوسری طرف خوشی بھی تھی کہ شوہر تو ملا اور کمینی نئی ماں اور کاظم ماموں سے پیچھا تو چھوٹا۔غریب لڑکیوں کی قسمت اور شادی ایسے ہی ہوتی ہے وہ گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے مختلف تو نہ تھی۔رات گئے جب وہ عارف کے گھر اتاری گئی تو شاید ڈھائی یا تین بج رہے تھے۔نیند کے جھونکوں اور گاڑی کے جھٹکوں نے بے حال کر رکھا تھا۔جس بستر پر اسے لیٹنے کو کہا گیا تھا وہاں لیٹتے لیٹتے اس نے اپنی خرانٹ ساس کی ہلکی آواز سنی تھی ”خبردار عارف لڑکی کو ہاتھ نہ لگانا“۔اسے یہ بات عجیب تو لگی مگر نیند کے جھونکے نے سوچنے نہ دیا۔صبح جب وہ جاگی تو کمرے میں کوئی نہ تھا۔وہ اکیلی ہی سوئی تھی۔شاید عارف نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔فطری حیا نے آگے سوچنے نہیں دیا،ابھی کچھ اور سوچتی کہ دروازہ کھلا”اٹھ لڑکی نہا دھو کر کچھ کھالے کچھ اور لوگ آئیں گے تجھے دیکھنے“اور ہاں اچھی ساڑھی پہن کر بال ڈھنگ کے بنالیجیو ذرا اچھی لگے صورت شکل“اس کی مسکراہٹ میں چھپی خباثت اسے بڑی کھٹکی“۔اندازے سے اس نے غسل خانہ تلاش کیا نہا کر بکسے میں سے اچھی والی ساڑھی نکالی،پہن کر بال بناتے وقت اس نے خود کو پہلی بار آئینے میں دیکھا،وہ سچ میں بہت خوبصورت تھی،کچھ سوچ کر اس کے چہرے پر شرمگیں مسکراہٹ نے قوس قزح کے رنگ بکھیر دیئے،وہ آئینے کے سامنے زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکی۔دروازہ کھلا شاید عارف تھا۔”یہ ناشتہ کرلیو اور نیچے آجائیو مائی بلا رہی ہے“اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی ہوس تھی،وہی آنکھیں اس نے کاظم ماموں کی دیکھی تھیں جب وہ اکثر ان کے گھر آتا۔یہ محبت کی زبان تو نہ تھی۔رات کا آخری جملہ اسے پھر یاد ایا ”خبردار عارف لڑکی کو ہاتھ نہ لگانا“۔اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا،ناشتہ شاید کسی ٹھیلے سے آیا تھا،ردی پیپر میں بندھا۔اسے کچھ اٹ پٹا ضرور لگا کہ گھر میں کوئی اور نہیں تھا،نہ ناشتہ باورچی خانے میں بنا تھا۔بھوک کب کسے کیا سوچنے دیتی ہے،کل رات سے وہ بھوکی تھی جو کچھ بھی ملا اس نے کھالیا،چائے کانچ کے گلاس میں ٹھنڈی ہونے کو تھی پھر بھی اس کے اپنے گھر سے تو اچھی تھی۔اچانک اسے سکو بائی کی چائے یاد آئی،وہ چائے بڑی اچھی بناتی تھی،کاش وہ ہوتی،اس کے بیاہ کے وقت تو اتنی روکھی پھیکی شادی تو نہ ہوتی۔”سکینہ نیچے آؤ،اور کتنی دیر لگے گی تیار ہونے میں“اس کی ساس کی آواز نے اسے کمرے میں ہونے کا احساس دلایا اور وہ اندازے سے دروازے کی طرف بڑھی جہاں اسے کل رات تنگ سیڑھیوں سے اوپر چڑھایا گیا تھا۔

نیچے کئی لوگ تھے۔تین مرد اور دو اورعورتیں،یہ پڑوسی تو ہرگز نہ لگے،ان کی چبھتی نگاہوں نے اسے خود

کو سمیٹنے پر مجبور کیا، اس نے ساڑھی کا پلو کچھ اور سامنے کر لیا۔''ارے یہ کیا کر رہی ہے لڑکی؟ وہ تجھے دیکھنے آئے ہیں اور تو ہے کہ چہرہ ڈھانک رہی ہے، پلو ڈھلکا دے دیکھ تو لیں تجھے سب اپنے ہی ہیں''۔ اس کی ساس کی سخت آواز مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ گونجی۔

اسے لگا سارے قصائی مل کر گائے خریدنے سے پہلے جس طرح ٹٹولتے ہیں وہ سب اسے اسی طرح دیکھ رہے تھے۔

''ارے بی بی ایسے ہی دیکھتی رہو گی کچھ شگن تو رکھیو''۔ ان لوگوں کی بھاشا اسے عجیب لگی۔

''ارے ہاں کیوں نہیں، یہ رکھ لیو لڑکی''۔ ان میں سے ایک عورت اٹھی اور پانچ سو روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھتے رکھتے اس کا پلو سرکا کر اس کا سینہ دیکھنے لگی۔ سکینہ نے دوبارہ پلو سمیٹا۔ اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے اور اندر ایک عجیب قسم کا خوف سرایت کرنے لگا۔ اس نے ذرا ادھر ادھر دیکھا کہ شاید عارف کہیں دکھے تو خود کو محفوظ محسوس کرے مگر اس کا دور دور تک کہیں اتا پتا نہیں تھا۔''

''او پر جاؤ لڑکی عارف آجائے گا'' اس کی ساس کی مکروہ آواز پھر گونجی۔ مرتی کیا نہ کرتی ساڑھی سمیٹتی ایک چھلانگ میں زینے پر پہنچی اوپر کمرے میں پہنچ کر اس نے کمرے کا دوبارہ جائزہ لیا۔ یہ رہنے بسنے کا کمرہ تو نہ تھا، لگا بس کوئی رات گزارنے کے لئے استعمال کرتا ہو۔ دوپہر سے شام ہوگئی، عارف کا پتہ نہیں تھا، بھوک ختم ہو چکی تھی نیچے سے آوازیں بدستور آرہی تھیں مگر اتنی دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی۔

شام ہو چلی تھی۔ شاید رات بڑھ رہی تھی، عارف اندر آرہا تھا، زینوں پر قریب آرہی قدموں کی آہٹ سے وہ جاگ گئی، اس نے خود کو سمیٹا اور ساڑھی کا پلو سلیقے سے ڈھک کر بیٹھ گئی، بڑھتے قدموں کی آہٹ کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی، انجانے جذبوں نے کروٹ لی اور وہ خوف اور شرم کے ملے جلے احساس کے ساتھ بھیگنے لگی۔

''سکینہ یہ لو کھانا کھا لو۔ اور ہاں اس پیک میں برقعہ رکھا ہے، کھانے سے فارغ ہو کر پہن لینا، ہمیں سفر کرنا ہے، جلدی سے فارغ ہو جانا دس بجے کی ٹرین ہے'' جذبات سے عاری لہجہ اسے ہدایت یا شاید حکم دے رہا تھا۔''م م م م مگر ہم کہاں جا رہے ہیں!؟؟؟'' وہ ہکلاتے اور ہمتیں سمیٹتے پوچھ بیٹھی۔''ارے کیوں اپنی سسرال نہیں جانا ہے؟ یہ ہمارا عارضی ٹھکانہ۔ ہم دراصل ممبئی میں رہتے ہیں۔ وہیں جانا ہے، بس جلدی سے

تیار ہو جاؤ ساڑھے آٹھ تو ہو گئے۔"

اسے لگا آواز میں تمسخر تھا، یہ لہجہ کسی نو بیاہتا دولہے کا ہرگز نہیں تھا۔

اس نے کھانا زہر مار کیا اور برقعہ اوڑھ کر تیار ہو گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ انجانے جہنم سے جانے پہچانے جہنم اچھے ہیں مگر یہ انجانا جہنم اس کے لئے اپنے جانے جہنم سے بہتر تھا کیونکہ اس کا شوہر اس کے ساتھ تھا، وہ اس کے ساتھ کہیں بھی جانے کے لئے تیار تھی۔

ریل کا سفر بہت لمبا ثابت ہوا۔ ایک رات گزری اور شاید دوسرے دن کی دوپہر تھی کہ اسے جگایا گیا تھا۔ اس کی نیند بھی شاید غیر معمولی تھی، اتنا تو وہ کبھی نہیں سوئی تھی۔ ریل سے اتر کر وہ عالم غنودگی میں شاید کسی ٹیکسی میں بٹھادی گئی تھی اور پھر کسی اور گھر میں جو خاصہ بڑا تھا، منتقل کر دی گئی تھی۔ اس کی سوتی جاگتی کیفیتوں کی یادداشت بس اتنی ہی تھی۔

شاید وہ تیسرا دن تھا جب وہ پورے حواس میں آئی تھی۔

"لڑکی کیسی ہے، وہ کچھ زیادہ تو نہیں سو رہی؟ کہیں تم نے ڈوز تو زیادہ نہیں دے دیا تھا؟"

"نہیں مائی ڈوز معمولی ہی تھا مگر سفر لمبا ہونے کی وجہ سے ہم نے اسے دو مرتبہ انجیکشن لگائے تھے، شاید یہی وجہ ہے"۔

الفاظ تھے کہ بم کہ دھماکے تھے جو اس کی سماعتوں پر گر رہے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ آواز تھی جو اس کے کانوں پر پڑی تھی، یہ آواز میں نے کہاں سنی ہے۔ آواز۔۔۔آواز۔۔۔آواز۔ مانوس سی آواز مگر لہجہ تو یہ نہیں تھا.....یہ.....یہ.....یہ.....

اس نے یادداشت پر زور دیا مگر کچھ یاد نہیں آیا، سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ بھوک اور نقاہت کے مارے اس سے اٹھا بھی نہیں گیا۔ سر بڑی زور سے چکرایا اور وہ اٹھتے اٹھتے پھر لیٹ گئی۔

"ارے کوئی ہے!!" اس کی نقاہت بھری آواز ابھری۔

کررررررر سے دروازہ کھلا کوئی اندر آیا۔

"اٹھو لڑکی خود کی صفائی کر لو" آواز بہت زیادہ کرخت تھی۔

"میں اٹھ نہیں سکتی۔"

"اوہ" آواز غائب ہوگئی۔

پھر غالباً کوئی آیا، نرس یاد آئی تھی جو اسے جوس پلا رہی تھی، اسے کپڑے بدلنے اور خود کی صفائی کرنے میں مدد دیتی رہی۔ "آپ کون ہیں؟ میں کہاں ہوں؟" کے سوالات گونجتے رہے مگر کوئی جواب نہیں آیا، وہ شاید کوئی روبوٹ تھی یا پھر کوئی پراسرار خادمہ جو کسی مالک کے اشارے پر اس کی خدمت کر رہی تھی اور وا پس زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی۔

وہ بند کمرہ تھا اور اسی میں وہ سوتی جاگتی، خود کو حوصلہ دیتی اور اٹھتی رہی، شاید دس دن گزر رہے تھے۔ ہوش اور بیہوشی کے کئی دورانیے تھے، سوچیں عذاب تھیں کہ کہاں ہوں، عارف کہاں ہے؟ میں یہاں کیوں ہوں؟ مجھے عارف نے کہاں چھوڑا ہے؟ وہ جملے اور وہ آواز یاد آتی جسے اس نے دوبارہ نہیں سنا۔

شاید وہ دسواں دن تھا اس کے اندازے سے جس دن کمرے کا دروازہ کھلا اور جسے دیکھ کر وہ دوبارہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ "دیکھو لڑکی تم اتنے ہوش میں تو ہو اب کہ میری بات کو سن اور سمجھ سکو، تم ہمارے ہاں لا کر بیچی گئی ہو، پورے دو لاکھ میں، اب سیدھے طریقے سے سمجھ لو کہ تمہیں وہ دو لاکھ روپے ہمیں کما کر دینے ہیں اور یہاں رہنے بسنے اور سہنے کے طریقے سیکھ لینے ہیں، اگر نہیں تو پھر ہم سے بھی بڑھ کر بڑی مچھلیاں اس سمندر میں ہیں، ہم تمہیں ان کو کل بیچ دیں گے، سوچ لو، چوائس تمہارے پاس ہے، یہاں رہنا ہے کہ تمہیں کچھ اور بڑے بھیڑیوں کے پاس جانا ہے خود کو نچوانے۔"

وہ مڑی اور جانے لگی۔

اُس کے حلیئے نے مبہوت کر رکھا تھا تیز چمکتی نارنجی ساڑھی اور کالے سلیولیس بلاؤز میں ملبوس سراپا، اونچا لمبا قد، کندھوں پر کھلے، سلیقے سے کٹے لہراتے سنہری بال، گلے میں پڑی موٹی سی سنہری چین، سڈول کھلی بانہوں کے آخر میں ایک ہاتھ پر سنہری گھڑی اور دوسرے ہاتھ میں کڑا، خوبصورت ترشے چمکتے ناخن اور مخروطی انگلیوں میں پکڑا، بڑا سا موبائل، وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھی، کیا وہ وہی تھی؟ کیا وہ وہی تھی؟ کیا وہ وہی تھی؟ بہت مشکل سے اس نے اپنے حواس پر قابو پایا اور کانپتے ہونٹوں سے آواز نکلی "سکو بائی"۔

لمحے کے ہزارویں سکینڈ کی تیزی سے وہ اپنی ایڑی کے بل مڑی اور پلٹ کر اسے دیکھا۔ "کیا کہا تم نے لڑکی؟" اس کی آواز میں حیرت، استعجاب، خوف فکر جانے کیا کیا تھا۔

اس کی ہمت بندھی اور اپنی آنکھوں میں اس نے ہمت سمیٹی، سیدھے سامنے گھورتی آنکھوں میں جھانکا اور دوبارہ گویا ہوئی ''سکو مائی! میں سکینہ ہوں''۔

''سکینہ کون سکینہ؟ میں کسی سکینہ کو نہیں جانتی۔ لڑکی ہوش میں آ۔ میں میڈم کانتا کے نام سے جانی جاتی ہوں، لڑکیاں خریدنا انہیں دھندے پہ لگانا اور زور آور نکلیں یا اچھے دام ملے تو انہیں دوسری جگہ بیچنا میرا کام ہے۔ تم کوئی نئی نئی کہانی مت سنانا میرے لئے ساری پرانی ہیں تم میرے لئے صرف ایک مال ہو بس'' اس کی اونچی ہوتی آواز اور کھوکھلا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ اسے پہچان گئی ہے۔

اس نے دوبارہ ہمت جتائی اور دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہا ''سکو مائی، میں تمہاری سکینہ ڈھور گاؤں کی جہاں تم رہتی تھیں نارائن کے ساتھ''۔

''لڑکی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا، میں نے کیا کہا میں اس کوٹھے کی مالکن ہوں، کانتا میڈم، سمجھ میں آئی بات، اور کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں۔ صرف اور صرف کانتا میڈم''۔ وہ اس کے قریب آ کر اس کا بازو تھام کر غرائی۔ سکینہ کو اس کے لمبے تراشیدہ پالش شدہ ناخن اپنی جلد میں چبھنے لگے۔ ایک لمحے کو وہ گھبرائی ضرور مگر اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس نے سرگوشی کی ''نہیں تم میری سکو بائی ہی ہو!!!!'' سکینہ نے محسوس کیا کہ پل بھر کو اس کی نظریں لڑکھڑائی تھیں اور آنکھوں کے کٹوروں میں نمی چھلکی تھی، وہ بنا کچھ کہے تیزی سے مڑی اور ملازمہ کو حکم دیا، اس لڑکی پر خاص دھیان رکھو یہ اس کمرے سے باہر نکلنے نہ پائے۔ سکینہ نے محسوس کیا اس کی چال اور آواز میں پہلے والی خود اعتمادی نہیں تھی۔

وہ رات سکینہ پر بہت بھاری تھی۔ کیا وہ فروخت کی گئی تھی؟ کس نے کیا؟ نئی اماں اور کاظم ماموں نے؟ جیپ میں بیٹھتے وقت ان کی مخصوص فاتحانہ مسکراہٹ اور چہرے پر پھیلے خباثت کے سائے اسے اچانک یاد آئے۔ درد لاوا بن کر بہہ نکلا۔ وہ بہت زیادہ مذہبی تو نہ تھی اور نہ اس نے دین سیکھا تھا مگر اپنے خدا کے ہونے کا اسے احساس ضرور تھا۔ اسے اچانک شکایت ہوئی اپنے اللہ سے۔ ''مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔؟ میں نے کچھ پاپ تو نہیں کیئے تھے پھر میری قسمت میں یہ سب کیوں؟ کہاں شادی شدہ زندگی کی تصویریں سجاتی میں اور کہاں یہ جہنم! ہر ناانصافی میرے ساتھ کیوں؟ اماں کو چھین لیا، بابا کا پیار نہیں ملا، نئی اماں اور بابا کے ظلم، مار کٹائی الگ، سب پر صبر کر کے میں نے شادی کے لئے ہاں کی کہ صرف اس جہنم سے

نکلوں اور اس کا انجام اتنا بھیانک۔کیا کچھ لوگ اتنے بھی سیاہ بخت ہوتے ہیں‘‘ وہ اپنے رب سے شکایت کرتی رات بھگوتی رہی۔کب صبح ہوئی اسے اندازہ نہ ہوا۔

’’اٹھو لڑکی، منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھالو اور رونا بند کر دو، اب یہ کوٹھا ہی تمہاری قسمت ہے،اس حقیقت کو جتنی جلدی مان لو، اتنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ اس سے بھیانک جہنم میں جھونکی جاؤ گی،ان چھوئی، خوبصورت اور تازہ کچا گوشت ہو،تمہارے خریدار بہت ملیں گے میڈم کو اور وہ کبھی نقصان کا سودا نہیں کرتیں‘‘۔خادمہ کے جملوں نے اسے ہلا ڈالا’’کچا گوشت! کیا میں کچا گوشت ہوں؟‘‘ ذہن میں جھما کے سے ہوئے اور وہ گہرے اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔

اسے جب ہوش آیا تو کوئی اس پر جھکا ہوا تھا’’اٹھو یہاں یہ سب نخرے نہیں چلنے کے۔جتنی جلدی ٹھیک ہو جاؤ اتنا بہتر ہے۔ارے انعم وہ عیسیٰ سیٹھ یا پھر دامودر سیٹھ سے بات کرلو ان خبیثوں کو ایسی کبوتری بہت بھاتی ہے اچھا دام ملے گا‘‘

’’انعم!؟‘‘ یہ دوسرا جھما کا تھا۔’’انعم یہاں؟‘‘ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ اس کے باز و کھڑا اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔’’انعم تم یہاں؟؟‘‘ بڑھی مونچھوں فرنچ کٹ داڑھی اور عینک لگے چہرے کے پیچھے اس نے اپنے بچپن کے دوست انعم کو پہچان لیا تھا۔’’انعم تم بھی یہاں ہو؟‘‘

اسے بجلی کے جھٹکوں پر جھٹکے لگ رہے تھے۔انعم نے حیرت سے اسے دیکھا۔نوجوان کھلتی دوشیزہ نقاہت میں ڈوبی پڑی تھی۔

’’تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتی ہو؟‘‘

’’انعم میں سکینہ ہوں، تمہاری دوست سکینہ چھلکوں کی گاڑی پر بیٹھنے والی!! یاد آیا۔؟‘‘ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

اس نے نیچے بیٹھ کر اس کے قدم پکڑ لئے۔

’’مائی تو مجھے بیچ، کوٹھے پر بٹھا یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کووں کو کھلا تیرا حق ہے۔میں نے تیرے ہاتھ کی روٹی کھائی ہے، تیری گود میں سر رکھ کر سوئی ہوں، میرے ان بالوں میں تو نے تیل لگایا، کنگھی کی ہے، پھولوں کا گجرا لگایا ہے۔میرے اسی منہ کو تو نے کتنی بار دھلایا ہے، پوڈر لگا کر سفید گڑیا بنایا ہے، تجھے انہی لمحوں کا

واسطہ، جب تو میری مائی تھی اور میں تیری سکینہ تھی۔ یاد کر مائی یاد کر۔بس ایک بار کہہ دے تو میری مائی ہے۔‘‘وہ اس کے قدموں پر پڑی دھاڑیں روتی جا رہی تھی اور ہذیانی انداز میں پکار رہی تھی
’’سکو مائی! سکو مائی! سکو مائی۔‘‘

اس نے آہستہ سے اپنے قدم سکینہ کی ڈھیلی پڑتی گرفت سے چھڑائے اور انعم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی بنا کچھ کہے نکل گئی۔کمرے میں جانے کتنے گھنٹے وہ زمین پر یونہی پڑی رہی۔ پھر وہی خادمہ تھی وہی کھانے کا اصرار تھا اور وہی تنبیہہ تھی کہ وہ خود کو کوٹھے پر بیٹھنے کے لئے تیار کر لے۔اور اس کی ساری اندھیری دنیا جہاں کوئی روزن نہیں تھا جو امید کی روشنی دے جاتا۔اس کے آنسو بہتے اور خشک ہوتے رہے، بے بس بے مول آنسو بہیں اور خشک نہ ہوں تو اور کیا کریں۔

اسے کمرے میں بند کر دیا گیا۔کوئی ذی نفس اسے دیکھنے کو نہ ملتا،شاید یہ نفسیاتی دباؤ کی کوئی دوسری صورت تھی کہ وہ بات کو مان لے۔کھانے کے اوقات میں بس وہ خادمہ دیکھنے کو ملتی جو کھانا دے جاتی ورنہ کوئی اور صورت اسے نظر نہیں آتی۔

’’تمہارا کیا خیال ہے انعم اس سکینہ کے ساتھ کیا کیا جائے!!!!؟‘‘میڈیم کانتا اپنے سیکریٹری انعم سے مخاطب تھی۔

’’میں کیا کہہ سکتا ہوں میڈم جی میں تو خود آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔آپ جو فیصلہ لیں گی درست ہو گا۔ آپ نہ ہوتیں تو جانے میرا ڈھانچہ صحرا میں کہاں پڑا ملتا۔وہ عرب تو مجھے لے ہی گیا تھا‘‘انعم کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔وہ ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔

’’مجھے امید نہیں تھی وہ اچانک ایک دن میرے سامنے یوں آجائے گی‘‘اس کی محبت ایک طرف زنجیر بن رہی ہے تو دوسری طرف اس کے باپ کی نفرت مجھے اکسا رہی ہے کہ اسے بھی اسی طرح کتوں سے نچواؤں جس طرح....‘‘وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور اس کی پیشانی کی رگیں ابھر آئیں، آنکھیں شعلے برسانے لگیں اور مٹھیاں بھینچ گئیں۔انعم کو اس کی اس کیفیت کا اندازہ تھا، وہ ہلکے سے پانی کا گلاس بھر رہا تھا اور ٹشو پیپر کو اس نے کانتا کی طرف بڑھایا۔

’’میڈم کول ہو جائیں، یہ آپ کے لئے ٹھیک نہیں آپ کا بی پی پھر سے ہائی ہو جائے گا۔سنبھالیں خود کو

آپ گئے وقت کو لوٹا نہیں سکتیں‘‘ وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

’’میں گئے وقت کو لوٹا نہیں سکتی، مگر گئے وقت کا انتقام ضرور لے سکتی ہوں، ایک ایک کر کے اور دیکھو بھگوان بھی میرا کس طرح ساتھ دے رہا ہے ہاہاہاہا! واہ بھگوان تیری مایا بھی بڑی انمول ہے کس کس کو کہاں پہنچاتا ہے، سچ ہے تو زموہی نہیں ہے، نہ تو کسی کا حساب ہی باقی رکھتا ہے، سب کو حساب چکانے کا ایک چانس تو ضرور دیتا ہے۔ ہاہا‘‘ اس کا تیز ہوتا قہقہہ ہذیانی ہو رہا تھا۔

انعم کے بدن میں دوبارہ جھرجھری اٹھی

’’کیا آج پھر کسی کی قربانی دی جائے گی؟ کیا آج پھر اس کوٹھے پر وہی چیخیں اور سسکیاں گونجیں گی؟‘‘ ایک عجیب سی کراہیت، خوف اور گھبراہٹ نے اسے گھیر لیا۔

وہ ہمت کر کے آگے بڑھا، دوبارہ اس نے گلاس بھرا اور ٹرانکولائزر کی شیشی کھولی۔ دو گولیاں ہتھیلی پر انڈیلیں اور ہاتھ آگے بڑھایا۔

’’میڈم اسے لے لیں پھر آپ جو چاہے کریں۔ آپ کچھ بھی غلط نہیں کرتیں، مجھے یقین ہے اسے لے لیں پلیز۔ خود پر قابو پا لیں یہ بہت ضروری ہے‘‘۔ وہ بہت رسان اور دھیمے لہجے میں اسے کہہ رہا تھا۔

کانتا نے گولیاں اٹھالیں اور پانی کے ساتھ نگل گئی۔ کرسی پر دھم سے گر گئی اور گہری سانسیں بھرنے لگی۔ ایسے جیسے بہت دور سے چل کر آ رہی ہو، اس کے چوڑے خوبصورت ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں، انعم اسے غور سے دیکھ رہا تھا، وہ خود پچیس کا ہو رہا تھا مگر میڈم کی عمر جیسے ٹھہر گئی تھی۔ اتنی سندر اس عمر میں بھی۔ میری اماں تو بوڑھی ہو گئی ہو گی۔ اسے اپنا گاؤں اور گھر یاد آ گیا، جانے سب کیسے ہوں گے، آنکھوں میں امڈتے طوفان کو چھپانے کے لئے وہ مڑا اور اے سی کا ریموٹ اٹھا کر اس کے نمبر بڑھانے لگا۔ اس نے دیکھا میڈم نے آنکھیں موند لیں تھیں۔ وہ آہستہ قدم باہر جانے کے لئے نکلا۔

’’انعم رکو!‘‘ میڈم کی حتمی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔

’’یس میڈم!‘‘

وہ الہ دین کے جن کی طرح باادب کھڑا اس کے حکم کا منتظر تھا۔

’’عیسیٰ سیٹھ کو فون کرو کہ وہ اسے آ کر دیکھ لے پسند آئے تو لے جائے یا پھر خرید لے‘‘ کہنا ہمارے ہاں

تازہ اور کچا گوشت آیا ہے"

نعیم فون کے نمبر ڈائیل کرنے لگا۔

بلند قامت قوی ہیکل ادھیڑ عمری کی حدود سے گزرتا عیسیٰ سیٹھ اس کے سامنے اپنی تمام تر مکروہ خباثتوں کے ساتھ، دانت نکالے بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے دلبر جانی! بہت دنوں بعد یاد کیا اپنے عاشق کو.. بہت دنوں بعد یاد آئی ہماری۔ ویسے کون کہتا ہے تمہاری عمر ڈھل رہی ہے آج بھی کالز لے لو تو سب سے زیادہ قیمت تو تمہاری ہی لگے۔ پتہ نہیں کیوں تم نے جوگ اوڑھ رکھا ہے مگر ہو تو عورت ہی جسم کی آگ بلا ہی لیتی ہے۔ کہو کیا حکم ہے" عیسیٰ بھائی کے منہ سے رال ایسے ٹپک رہی تھی جیسے کچے گوشت کو دیکھ کر کتے کی رال ٹپکتی ہے۔

"تمہیں عورت اور اس کے جسم کے علاوہ کچھ سوجھتا بھی ہے خبیث؟ میرے اندر جسم کے علاوہ بھی کچھ دکھتا ہے تمہیں؟" وہ ہلکے سے غرائی "ہمارے پاس ایک کبوتری آئی ہے گاؤں سے، اسی گاؤں سے جہاں سے تم نے مجھے خریدا تھا۔ ان چھوئی ہے بالکل کچی کلی، صرف بیس سال کی ہے"۔ اس کی آواز خود اسے کسی گہرے کنوئیں سے آتی سنائی دی۔ اس کا وہ کاروباری انداز اور لہجہ اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ عیسیٰ نے اس کی غائب دماغی محسوس کی مگر تھا کائیاں، اس کے لئے انسانی جذبات سے زیادہ عورت کا جسم اہم تھا۔

"بولو کیا قیمت لگاتے ہو؟"

"ارے میری جان، تم سے بھاؤ تول کیا کرنا تم جو کہو منظور، بس ذرا مسکرا کر بیوپار کر لو۔ تمہاری ایک نگاہ کے لئے تو یہاں تک بھاگا چلا آتا ہوں ورنہ اس گوشت مارکیٹ میں بہت سی نائکائیں بیٹھی ہیں۔ تم کہیں گم ہو گیا؟" وہ اسے بھوکی نگاہوں سے تک رہا تھا جس پر عمر رک گئی تھی، وہ عمر کے ساتھ اور نکھرتی جا رہی تھی جبکہ بازار کی تمام تر طوائفیں اپنی رونق وقت کے ساتھ کھوتی جا رہی تھیں۔ ویسے بھی کانتا میڈم کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اس نے کوٹھا سنبھالنا چھوڑ دیا ہے اور اپنے اس سمندر کنارے والے بنگلے میں لڑکیوں کا کاروبار ہی سنبھالتی ہے اور بہت سارے گروہوں سے اس کے تعلقات ہیں جو انسانی گوشت کے اس کاروبار سے جڑے تھے۔ کہاں کیا چلتا ہے، سب اسے خبر رہتی اور وقت نے اسے گھاگ تاجر بنا دیا تھا جس میں رحم نام کی چیز تھی ہی نہیں۔ چھوٹی عمر کے لڑکے اور ہر عمر کی عورتوں کی تجارت کس طرح کرنا ہے اس میں وہ ماہر جانی جاتی تھی۔

''کانتا کیا میں لڑکی دیکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں ضرور''وہ کسی گہری نیند سے جاگی۔

''چلو''

وہ خواب میں چل رہی تھی،اس کی تمکنت کہیں کھو سی گئی تھی۔عیسیٰ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

اس نے پلٹ کر انعم کو دیکھا،اس کی نگاہوں میں کئی سوال تھے اور انعم نے کندھے اچکا دیئے جیسے وہ کچھ جانتا ہی نہ ہو حالانکہ عیسیٰ کے ہر سوال کو وہ سمجھ بھی چکا تھا اور ہر سوال کا جواب بھلی بھانتی جانتا بھی تھا مگر سب سے اوپر اس کی وفاداریاں تھیں۔کانتا میڈم کے لئے یا سکو مائی کے لئے وہ خود کے دل کو ٹٹول نہیں پایا۔ عجیب سا درد خود اس کے اندر جاگا تھا شاید مائی کا درد اس کا اپنا درد تھا۔اتنے دنوں تک جانے کتنی لڑکیوں کا سودا کرنے میں وہ میڈم کا ماتحت تھا۔بھاؤ تاؤ،تول مول،پولیس کا بھتہ،ریڈ پر معاملات کا نمٹانا،اور نئی لڑکیوں کی آمد پر ان کی جانچ پڑتال،حفاظتی اقدامات،لڑکی کی بغاوت پر زدوکوبی،مارتوڑ،تھپڑ لاتے،گالی گلوچ،سب میں وہ شامل تھا۔مگر آج کیا ہوا تھا کہ ہر قدم بھاری تھا۔سکینہ کا سودا۔سکینہ اس کی بچپن کی دوست،اس کی ساتھی،اس کے گاؤں کی لڑکی،جس کے ساتھ اس کے بچپن کے دس سال کی یادیں جڑی تھیں۔وہ چلتے چلتے جانے کتنی صدیاں طے کر چکا تھا

''انّا سکینہ کو باہر لاؤ!''

وہ سکینہ کے کمرے کے باہر کھڑا آواز دے رہا تھا۔

دروازہ کھلا،وہ تینوں اندر آئے،وہ کمرے میں پڑے اکلوتے پلنگ پر بیٹھی،بے نور آنکھوں سے انہیں تک رہی تھی جس کی ہر امید مر چکی تھی۔کچھ لمحوں میں عیسیٰ کی آنکھوں نے سکینہ کے جسم کی اسکیننگ کر لی اور وہ مڑا۔''چلو ٹھیک ہے''اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے انعم نے اپنے دل کے دروازے بھی بند کئے اور میکانکی انداز میں روبوٹ کی طرح ان دونوں کے پیچھے چل پڑا۔

''کچھ ٹھنڈا منگواو!!!''شاید عیسیٰ تنہائی چاہتا تھا۔

انعم کے باہر جاتے ہی اس نے کانتا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''اس لڑکی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟''

''کچھ بھی نہیں''، وہ ہلکے سے غرائی ''تمہیں صرف اپنے مال سے مطلب رکھنا ہے۔ ویسے بھی اس دھندے میں کون کس کا سگا ہے؟ وہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔ میری سگی بیٹی ہوتی تو اس کی نتھ اتروائی میں ہی کرواتی، اور قیمت بھی میں ہی طے کرتی۔ کیوں تم نہیں جانتے طوائفوں کے گھر بیٹی کی پیدائش شگن مانی جاتی ہے اور بیٹے کی پیدائش بدعا۔ یہ نام نہاد شریفوں کی دنیا سے کھری اور سچی دنیا ہے۔ یہاں رشتوں کے ڈھکوسلے اور استحصال نہیں چلتا، سب کھرا کھرا کیش اور نقد ہی چلتا ہے سچا ویاپار۔ بنا کسی جذبے کے، یہاں عورت کا ہر جذبہ اور ادا بکتی ہے''۔ وہ پھر بلند آواز میں ہنسی جبکہ اس کا اپنا قہقہہ اسے کھوکھلا محسوس ہوا۔ عیسیٰ کو اس دن پہلے دن والی، ہذیانی انداز میں چیختی چلاتی، روتی گالیاں بکتی، ہوش سے بیگانہ، وحشت زدہ، جوانی یاد آئی جس کا گینگ ریپ کیا گیا تھا اور جو اپنے حواس میں نہیں تھی، اسے وہ بہت کم قیمت پر گاؤں سے خرید لایا تھا۔

اسے قابو کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی تھی کئی دن تو اسے سنبھالنے میں گزر رہے تھے، خواب آور دوائیاں کتنے دن تک دیتا۔ آخر میں اسے بہترین افیون یہی لگی کہ اس سے محبت جتائی جائے۔ اس نے اپنے سمندر کنارے والے بھوتیا گھر میں اسے رکھا اور اس کی محبت اسے زندگی کی طرف واپس لاتی رہی۔ ایک سال تک محبت کے نام پر وہ اس کے ساتھ کھیلتا رہا اور وہ اس کی عادی ہوتی گئی، وہ ایک دن نہ آتا، تو روتی، جھگڑتی اور تنگ کر دیتی۔ وہ تنگ آ گیا اور جس دن اسے معلوم ہوا وہ پیٹ سے ہے، تو وہ اسے ممبئی کے ریڈ لائٹ ایریا والے قحبہ خانے میں بیچ آیا اور کئی سال اس نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔

اس سے دوسری ملاقات حیرت زدہ تھی۔ مچھیروں کی بستی سے قریب والے بھوتیا گھر کو جو اس کے غیر قانونی کاموں کا اڈہ تھا، کوئی خریدنا چاہتا تھا اور جب ایجنٹ کے توسط سے وہ اس سے ملا تو ہکا بکا رہ گیا۔ میڈم کانتا اپنے نئے اوتار میں پوری جولانیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے جلوہ گر تھی۔ وہ اس کو دیکھ کر گھبرایا ضرور مگر بے شرمی اور بے ضمیری کا اثاثہ کام آ گیا جو اس دھندے کا ضروری وصف تھا۔ وہ پوری پکی پروفیشنل ہو گئی تھی، بنا کسی پس وپیش کے سودا طے ہو گیا اور اس نے گھر اس کے حوالے کر دیا۔

پھر ان کے دوبارہ تعلقات بنے جو محض پروفیشنل تھے۔ لڑکیاں لائی جاتیں، اس گھر میں ٹھہرائی جاتیں، سودے ہوتے، کئی لڑکیوں کی نتھ اتروائی اسی گھر کے کسی کمرے میں ہوتی، جو بہت زیادہ باغی اور منہ زور ہوتیں، ان کو سدھایا جاتا یا پھر کسی اور جگہ بیچ دیا جاتا۔ آہستہ آہستہ بھوتیا بنگلہ انسانی کچے گوشت کے بیوپار کا

مشہور ٹھکانہ اور اڈہ بن گیا تھا۔ اس کے کاروبار کے تانے بانے بین الاقوامی سطح کو چھو رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھی ہر لڑکی کو بیچ کر اسے لگتا اس نے خود پر ہوئے ظلم کا بدلہ لے لیا ہے۔ ایک عجیب سا سکون اور خوشی اسے محسوس ہوتی، جب لڑکیاں روتی گڑگڑاتی اور بلکتی بیچی جاتیں۔

مگر دس دنوں سے سکینہ نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ کیا خلش تھی وہ سمجھ نہیں پائی۔

یہ لڑکی۔ اس لڑکی نے اس کی خود اعتمادی، اس کے پروفیشنل امیج اس کی مہارت اور دبنگ شبیہہ کو ہلا دیا تھا۔ وہ جلد از جلد اس سے چھٹکارا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ اندرون ضمیر کی آواز اور سکینہ کی محبت کی دیمک اس کی خود اعتمادی کو کھوکھلا کر دیتی، وہ اسے خود سے دور کر دینا چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے عیسیٰ کو بلایا تھا، وہ جانتی تھی کہ یہ اس کی اپنی قبیل کی کبوتری کو محبت کی افیون دیکر قابو کر لے گا اور مارکیٹ میں بیچ دے گا۔ مگر جیسے ہی اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا، تو لگا وہ پہلے والا خوبرو جوان اور جاذب عیسیٰ نہ تھا، وہ بوڑھا ہو رہا تھا، اور چہرے کی قباحت نے اسے مزید مکروہ بنا دیا تھا۔ یہ یہ کیا میری سکینہ کے لایق ہے۔ ایک لمحے کے لئے وہ چونکی۔ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ وہ میری سکینہ نہیں ہے، اس نے شدت سے اپنے سر کو جھٹکا۔

”قیمت بولو“ وہ دونوں بیک وقت ایک ساتھ بولے تھے۔ انعم کولڈ ڈرنک کی بوتلیں تھامے کھڑا تھا۔

”تم بولو کیا چاہتی ہو، ویسے تم سے زیادہ جاذب تو نہیں ہے“ اس نے دانت نکالے۔ کانتا کو ابکائی آتے آتے رہ گئی۔

انعم نے فوراً کولڈ ڈرنک کی بوتل آگے بڑھا دی۔

”پانچ لاکھ۔“ وہ دھیرے سے بولی

”اس گنواری لڑکی کے پانچ لاکھ؟“ وہ بوکھلایا۔

”گنوار یا شہری ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے ان چھوئی ہے۔ بازار ادائیں سکھا دیتا ہے۔ وہ پھر ہنسی۔

”دو لاکھ بھی زیادہ ہیں۔“

”دو لاکھ تو میں نے بچو لئے کو دیئے ہیں۔ پولس کا خرچ الگ اور اس پر جو خرچ ہوا وہ الگ۔ پانچ سے ایک روپیہ کم نہیں۔“ اس کا انداز حتمی تھا۔ ”چار لاکھ سے اوپر نہیں“ وہ کاروباری تھا۔

”انعم بھرت بھائی کو فون کروان کو بھی گاؤں کی کبوتریاں بہت پسند ہیں۔“

وہ اٹھ گئی۔

”ارے ارے یہ کیا ظلم کرتی ہو جان۔آرام سے بیٹھو تو جاؤ،کہاں نکلی“

”دھندے کے وقت نخرہ نہیں،میں کسی کی جان نہیں ہوں،کانتا ہوں،میڈم کانتا،میرا نام عزت سے لو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی غرائی۔

پہلی بار عیسیٰ کو اس کی آنکھوں کی وحشت اور لہجے سے خوف محسوس ہوا۔

”ٹھیک ہے یہ لو پورے پانچ لاکھ“۔اس نے اپنی بیگ سے ہزار کے لال لال نوٹوں کی پانچ گڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

”مال لینے کب آؤں؟“ وہ خباثت سے مسکرایا۔

”پیسہ میرا،مال تمہارا،جب چاہے،مگر لڑکی کا کوئی مسئلہ لے کر تم واپس میرے پاس نہیں آؤ گے۔ اس نے تاکید کی۔

”ارے فکر کاہے کرو،مجھے کبوتریوں کو قابو کرنا آتا ہے۔کیوں!!“اس نے خباثت سے آنکھ ماری اور اس کے ہونٹ سیٹی بجانے والے انداز میں گول ہو گئے مگر کانتا کے چہرے پر پھیلی سختی اور آنکھوں سے نکلتے شعلے دیکھ کر اس کی سیٹی حلق میں اٹک گئی۔کیا وقت تھا،یہ کبھی اس کی بانہوں میں پھڑ پھڑاتی سہمی کبوتری آج زخمی شیرنی کی طرح اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔کیا یوں بھی وقت پلٹا کھا سکتا ہے۔اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی۔

”کل آکر لے جاؤ یا پھر یہیں نتھ اترائی کا انتظام کروا دیں؟“۔“وہ سختی سے پوچھ رہی تھی۔

”ممم میں کل فون کر دوں گا،دیکھوں کوئی اچھا گاہک مل جائے تو یا پھر میں۔وہ کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔

”انعم پیسے اٹھاؤ کل ان کا فون سن کر انتظام کر دینا“۔وہ تیزی سے مڑی اور اپنی کرسی کے پیچھے بنے دروازے کو کھول کر گم ہو گئی۔اس کیبن میں کسی کا داخلہ ممنوع تھا۔انعم کا بھی۔وہاں اس کی مخصوص ادھیڑ عمر خادمہ ہی جا سکتی تھی جو اس کے کھانے پینے اور مالش کے لئے مقرر تھی۔

اس کی مخصوص ملازمہ اناّ،جو نئی لائی گئی لڑکیوں کی برین واشنگ اور دیکھ بھال بھی کرتی تھی،دیر رات تک اس کے ساتھ تھی۔اس کی مالش کرتی،تیل لگاتی،کنپٹیاں دباتی اور دھیمی دھیمی سرگوشیوں میں اسے سمجھاتی

بھی رہی۔ انا شاید غلطی سے کوٹھے پر آئی تھی، حبشی نسل کی عورت تھی، سیاہ فام۔ چھوٹی عمر میں کوئی اسے بھگا کر لایا تھا اور استعمال کے بعد کوٹھے پر بیچ کر چلا گیا تھا۔ اب صورت شکل ایسی تھی نہیں کہ روز بکتی، کبھی کبھی بہت زیادہ ضرورت کا مارا شرابی جسے عورت کے کالی گوری ہونے سے فرق نہیں پڑتا، کم قیمت پر اس کے ساتھ رات گزار لیتا۔ جب سکو بائی کوٹھے پر بیچی گئی تو حاملہ تھی، جس نے خریدا اس نے اس امید پر اسے انّا کی دیکھ بھال میں رکھ دیا کہ لڑکی ہوگی تو دہرے فائدے میں رہے گی، چونکہ اس کے دن بھی چڑھ گئے تھے اور ابارشن کروانا ممکن نہ تھا۔ انّا اس وقت سے اس کے ساتھ تھی، حتیٰ کہ دردِ زہ کے وقت اس نے انا کے ہاتھ چبا ڈالے تھے اور جب نائیکہ کو معلوم ہوا کہ لڑکا ہوا ہے تو اس نے سکو کو ہزار گالیاں دیں اور کھانے پینے اور نقصان کے طعنے بھی دیے اور انّا کو حکم ہوا کہ بچہ کسی یتیم خانے کے دروازے پر چھوڑ آئے مگر سکو اسے کسی طرح اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہیں تھی کیونکہ وہ اس کی پہلی اور آخری محبت کی نشانی تھا۔ نارائن اس سے کبھی ہم بستری نہیں کرسکا کیونکہ وہ اس کے بس کی تھی ہی نہیں بس خادمہ بنی اس کے کام کرتی اور آخری دنوں کی خدمت نے نارائن کو اس بات کے افسوس سے آزاد کردیا کہ اس کے دس ہزار روپے بے کار نہیں گئے جو گاؤں میں اس نے سکو کی ماں کو دیئے تھے اور اسے چھوٹی عمر میں بیاہ کرلے آیا تھا۔ اس کے ساتھ زیادتی کرنے اور اسے عورت بنانے والے کئی تھے جنھوں نے اس کی اجتماعی عصمت دری کی تھی، مگر اسے حواسوں میں لا کر اس سے پیار کرنے والا عیسیٰ ہی تھا اور یہ بچہ بھی اسی کا تھا۔ کوٹھے والی نائیکہ کے ظلم جب حد سے بڑھے تو ایک دن وہ بچہ خود سے جدا کرنے پر راضی ہوگئی اور انّا کے سپرد کردیا۔ یہ صرف انا کو اور اسے معلوم تھا کہ بچہ کہاں ہے۔ اس نے بچے کو خود سے جدا تو کردیا تھا مگر ہر جمعرات درگاہ پر جاکر چڑھاوا کرتی اور اپنے بچے کو دیکھ کر آنکھیں سینک آتی۔

پھر وہ کوٹھے پر بیٹھ گئی اور اتنا کما کر نائیکہ کو دے دیا کہ سارے گلے شکوے دور ہوگئے اور جب نائیکہ کا آخری وقت تھا تو اس نے اور انّا نے مل کر اس کی اتنی دیکھ بھال کی کہ نائیکہ نے مرنے سے پہلے کوٹھا اور سارا کاروبار اس کے حوالے کردیا اور وہ سکو بائی سے کانتا میڈم بن گئی۔

سب سے پہلے تو اس نے یہ کیا کہ اپنا ٹھکانہ بدلا، عیسیٰ سیٹھ کا وہ بھوتیا گھر خریدا جس میں اس کی زندگی کے اچھے دن گزرے تھے، وہاں اسے کسی مرد کی محبت ملی تھی جو اس کے لئے تو سچی تھی کیونکہ اس کے جذبوں میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔ دوسرے وہ ماں بننے کے احساس سے لبریز ہوئی تھی جو ایک عورت کا ازلی خواب اور

خواہش ہوتی ہے۔سکینہ نے ممتا کے جو جذبے اس میں جگائے تھے وہ یہاں تکمیل کو پہنچے تھے اور سب سے بڑھ کر اسے اپنا اسٹینڈرڈ بدلنا تھا۔وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ عام کوٹھوں سے اوپر کی چیز ہے۔سکو بائی سے وہ کانتا میڈم بن گئی جو فطرتاً حرافہ تھی۔ذہنی طور پر شاطر دلال اور لڑکیوں کی خرید و فروخت کے عالمی بازار کی اہم کڑی تھی۔اب اس نے جسمانی کاروبار بند کر دیا تھا بلکہ دوسروں کے جسموں کا کاروبار کرتی۔اس کے مراسم اور وسائل اتنے بڑھ گئے تھے کہ مارکیٹ میں جو چیز کسی کو نہ ملتی وہ کانتا میڈم کے پاس ضرور موجود ہوتی۔لڑکیاں،عورتیں،بچے، لڑکے،غلامی کے لئے مزدور،ہر قسم کا جنس اور انسانی گوشت اس کے پاس موجود ہوتا۔انعم بھی اسی خرید و فروخت کی کڑی کا ایک حصہ تھا۔انعم کو دیکھتے ہی اسے انعم کے باپ کا احسان یاد آیا جس نے عصمت دری کے بعد اس کا بدن ڈھانکا تھا،اسے پانی پلایا تھا اور تین دن تک اس کی دیکھ بھال کی تھی،جب تک عیسیٰ آ کر اسے وہاں سے خرید کر نہیں لے گیا۔اس کی عصمت دری میں گاؤں کے ہر کتے نے اس پر منہ مارنے اور موتنے میں کمی نہیں کی تھی سوائے انعم کے باپ کے۔شاید وہ وفادار کتا تھا اس لئے مالک کی چھوڑی جوٹھن پر منہ مارنے کی جسارت نہ کر سکا یا پھر سکو بائی کی بدحالی پر اسے رحم آ گیا تھا۔اس لئے جب انعم گاؤں سے اٹھوا کر لایا گیا تھا تو اس نے اسے کافی بڑی رقم دے کر خریدا اور اپنا ملازم خاص بنا کر رکھ لیا ورنہ انعم کی لاش اور ہڈیاں بھی کسی صحرائی شتر ریس کا حصہ ہوتیں اور کہیں گڑی ہوتیں۔

عیسیٰ کی طرح اس کے پاس کئی قسم کے ایجنٹ موجود تھے جو اپنا مال اس کے پاس رکھواتے اور اس کا مال بڑی مارکیٹ کے لئے خرید لے جاتے۔انّا کے ساتھ دیر رات تک باتیں کرتی وہ اپنے ماضی کا سفر کر آئی۔

صبح بڑی مضمحل اور سست تھی،اس نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا تھا مگر اسے لگا وہ سالوں کا سفر طے کر آئی ہے۔یادیں تلخ ہوں تو سفر کڑوا اور تھکن آور ہی ہوتا ہے اور اس کا ماضی تو جہنم تھا جہنم۔

گرم کافی کے ساتھ درد کش (پین کلرز) دوا لے کر اس نے آفس میں آ کر بیٹھنے کی ہمت جٹائی۔بہت ساروں کے وائس ریکارڈ میسیج تھے جن کا اسے جواب دینا تھا۔ہمت مجتمع کر کے وہ جوابات دیتی رہی۔وہ کئی زبانیں بیک وقت بول رہی تھی،بالکل پروفیشنل ایجنٹ کی طرح۔انعم ہر مرتبہ چونکتا ضرور تھا،بازار حسن نے نہ صرف اس کے ظاہری حسن اور رکھ رکھاؤ کو نکھارا تھا بلکہ اس کے اندر کی خوبیاں اور ذہانت کھل کر باہر آ گئی تھیں۔سچ ہے کتابیں اور تعلیم وہ نہیں سکھاتے جو حالات سکھا دیتے ہیں۔انعم کے لئے میڈم کا کوئی بھی کام غلط نہ لگتا کیونکہ وہ اس

کے حصے کی خدا تھی۔اس نے اس کی مقدر موت کو زندگی میں بدل دیا تھا اور وہ اس کا بے دام غلام تھا۔

ہر بار وہ جب بھی کاروبار کے لئے اپنے آفس میں آ بیٹھتی اور ماہرانہ انداز میں کاروبار سنبھالتی قضیے نمٹاتی اور ڈیلنگ کرتی تو اسے بڑی خوشی محسوس ہوتی۔اپنی اس ترقی پر اپنے بڑھتے بنک بیلنس پر اور اپنے پھیلتے کاروبار پر۔مگر آج وہ خوشی وہ احساس برتری اور دنیا پر حکومت کرنے کا احساس کہیں گم تھا۔ایک رات کے یادوں کے سفر نے اس کے اندر کہیں گہری خندق بنا دی تھی جیسے کہ کہیں کوئی بھیانک زلزلہ آیا تھا اور دل کی زمین کہیں اندر کھسک گئی تھی اور گہری کھائی بن گئی تھی۔ پاتال کی اتھاہ گہرائیوں کی طرح جس کے اندر اس کا وجود تیزی سے گرتا جا رہا تھا۔وہ بہت کھوکھلی اور خالی لگ رہی تھی بہت خالی۔اس خالی پن کو کون بھرے کیا بھرے کیسے بھرے وہ بہت حیران پژمردہ اور ٹوٹ سی گئی تھی۔

انعم نے محسوس کیا کہ میڈم دس سال زاید عمر کی لگ رہی تھی اور اس کے چہرے کی خوبصورتی ماند پڑگئی تھی جیسے کہ چاند گہنا گیا تھا،سیاہ پڑ گیا تھا۔

''اس عیسیٰ کا فون آیا؟ا''س کی آنکھوں نے سوال کیا۔

''ہاں میڈم! شام تک کسی اور ایجنٹ کو لے کر وہ یہاں آئے گا،جو شاید اسے یہاں سے لے جائے۔''

''ٹھیک ہے، انّا سے کہہ کر اس کی تیاری کروا دو،اور وہ لوگ آئیں تو مجھے اندر انٹر کام پر اطلاع دے دو۔''وہ پھر اپنی کرسی کے پیچھے بنے دروازے سے غائب ہو گئی۔

سرد خنک شام کی دھندلاہٹ شہر کی بڑھتی ٹریفک نے اور بڑھا دی تھی۔انّا نے آ کر اس کے مخصوص ساؤنڈ پروف کمرے کی بتی جلا دی تو اسے احساس ہوا کہ وہ دوپہر سے ٹہل رہی تھی اور اسے شام کے اتر آنے کا احساس بھی نہیں تھا۔یہ کیسی بے چینی تھی۔ یہ دل کا کون سا عالم تھا،کون سی تنزیل تھی جو اس پر اتاری جا رہی تھی۔ اندھیرے جب حد سے بڑھ جائیں تو صبح قریب ہوتی ہے۔اس کے دل کے اندھیرے گہرے ہو رہے تھے جن کو کسی روشن صبح کا بے چینی سے انتظار تھا۔

انٹر کام پر انعم کی آواز ابھری۔

''میڈم عیسیٰ سیٹھ آئے ہیں،ساتھ میں دو اور سیٹھ لوگ بھی ہیں آپ باہر آجائیے''!!!

اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے،ٹشو سے پانی سکھایا،بالوں پر برش پھیرا اور چہرے پر میک اپ

کی ہلکی تہہ جما کر باہر نکلی، اس کا حسن جگمگا تو رہا تھا مگر آنکھوں کی اداسی اندرون گہرے دکھ کی غماز تھی۔

جیسے ہی اس نے دروازہ کھول کر کیبن میں قدم رکھا کمرے میں موجود لوگوں کو بجلی کا جھٹکا سا لگا اور وہ بیک وقت صوفے سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ان کی ہڑبڑاہٹ نے کانتا کو لمحہ بھر کے لئے چونکا یا جب اس کی آنکھیں تیز روشنی میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے ان دونوں کو غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ وقت کی گرد اور عمر کے سفر نے ان کے چہروں کی خباثت گہرا دی تھی اور چہرے دھندلا بھی گئے تھے مگر عورت اس چہرے کو کب بھولتی ہے جو پہلی بار اس کی مہر بکارت کو توڑے۔۔۔!!!

تم ذلیل حرامی کتے! تمہاری یہاں قدم رکھنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ وہ چیخ پڑی۔ اس کی آواز میں ہذیان، نفرت، حقارت، شدت بھری ہوئی تھی۔

''اور عیسیٰ سیٹھ! تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ اس مردود کو تم یہاں لے آئے''!!

میڈم میں مال خرید چکا ہوں، اب میں قصائی کے حوالے کروں یا خود ذبح کروں آپ کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیئے۔ آپ جسم فروشی کی مارکیٹ میں بیٹھی ہیں، یہاں جذبات نہیں دھندا چلتا ہے دھندا!!'' عیسیٰ گزشتہ کل کی بےعزتی کے پورے بدلے چکا رہا تھا۔

''میں نے ان سے سودا طے کرلیا ہے، مال ہمارے حوالے کردو۔ ہمارا دھندہ صرف زبان کے اعتبار پر چلتا ہے اور زبان سے پھرنے والے کی سزا تم جانتی ہو''

''اوے حرام کے جنے زبان کی قیمت اور دھندے کا اصول تو مجھے سکھائے گا۔ تو جس نے میرے ساتھ دھوکہ کیا تھا اور یہ دو خبیث جنھوں نے مجھے تار تار کر دیا تھا، تم لوگ میرے ساتھ سودا کرو گے؟ چلو جاؤ میں نہیں دیتی لڑکی۔ سودا کینسل''۔

''انعم سیٹھ کے منہ پر اس کے پیسے مارو''۔

اس سے پہلے کہ وہ جملہ مکمل کرتی عیسیٰ نے دیسی گنتہ نکال لیا۔

''سودا کسی بھی صورت میں کینسل نہیں ہوگا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔''

کانتا نے اپنے پیروں کے نیچے کا شاید کوئی بٹن دبایا تھا اور دو بلیک کمانڈوز گنز کے ساتھ ان کے سروں پر کھڑے تھے۔ چشم زدن میں منظر پلٹ گیا تھا۔

’’اور تو کتے ہرن پٹیل! تو بول آج تجھے کتوں سے نچواؤں کہ ہجڑوں کے حوالے کروں جو ایک عورت پر قابو نہیں کرسکا تو اس حبشی حرامی کو لے آیا تھا مجھ کو قابو میں کرنے اور مجھے میرے گھر سے اٹھوانے۔ بول کیا کروں میں تیرا؟ مرچیں بھرواوں تیرے پچھواڑے میں کہ ان بلیک کیٹس کے ڈنڈے گھسواؤں۔ اور تو سالے حرامی کالے سور! تیرا کیا کروں؟ تیرے ٹکڑے ٹکڑے کرکے میرے بلڈ ہاؤنڈ کو کھلواؤں کہ ویسے دس کتوں کو تجھ پر چھوڑ دوں؟؟ حرام کے جنو! نامردو! ایک عورت قابو نہیں ہوتی تو کتوں کی طرح پل پڑتے ہو نوچنے۔ ارے کیا کروں میں تمہارا؟‘‘

وہ ہذیانی انداز میں بے قابو چیخ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھی اور سرخ منہ سے ٹپکتی رال نے اسے چنڈی بنا دیا تھا۔ عیسیٰ نے ہمت کر کے گنتہ لہرایا ’’اے! حرامی، بازارو رنڈی فاحشہ عورت تیری یہ مجال کہ تو ہرن سیٹھ کو گالی دے۔ ارے یہ تیرے جیسی ہزار عورتیں خرید سکتا ہے کسے گالی دے رہی ہے؟ ہوش میں آ! دھندے کی مارکیٹ میں بیٹھی ہے۔ تیرا دھندہ! سمجھ گئی!!!! اور تو ختم ہوئی۔‘‘ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے نعم کی گن اس کی پسلی پر لگ چکی تھی۔

’’میں حرامی، فاحشہ بازارو، رنڈی۔ تو تم کون ہو رے سورو؟ مجھے بازارو کس نے بنایا؟ مجھے نوچا اور بھنبھوڑا کس نے؟ ارے میں تو ایک بیاہتا مزدور عورت تھی اس گاؤں کی جس کو اس کے مرد نے بھی نہیں چھوا تھا۔

اور اس حرامی ہرن پٹیل نے مجھ پر منہ مارنے کی کوشش بھی کی تھی اور میں اس کے آفس میں اس کے منہ پر تھپڑ اور اس کی کھلی پینٹ پر لات مار کر آئی تھی۔ یہ نامرد مجھ پر قابو نہیں پا سکا تو اس نے اس حبشی کتے کو بلوایا، اپنے گاؤں کے لوگوں کو جمع کیا اور سارے سور تماشا دیکھتے رہے اور یہ مجھے نوچتا رہا پھر باری باری ان لوگوں نے مجھ پر تھوکا، ذلیل کیا اور موتا... تو کہتا ہے یہ بڑا آدمی ہے، یہ بڑا آدمی ہے؟ یہ نامرد ہے نامرد!

حرامیو! رنڈی کی اولادیں تو تم ہو جو شریف عورتوں کو اٹھواتے ہو، منہ کالا کرتے ہو اور انھیں بازار میں بٹھانے والے تم ہو تم۔ میں تو شریف عورت تھی، بہت شریف۔ اپنے لقوہ مارے مرد کی خدمت اور اس کے جنگل کی رکھوالی کرتی تھی۔ ایک شریف عورت۔ مگر تم بازارو مرد شریف عورت کو شریف رہنے کب دیتے ہو؟ تمہیں تو ہر عورت اپنے بستر پر چاہئے ہوتی ہے۔ ہر عورت چاہے وہ کسی کی بیوی، بہن بلکہ خود تمہاری بیٹی ہی کیوں نہ ہو! اسے بھی تم جیسے لوگ گندی نگاہ سے دیکھتے ہو۔ مجھے فاحشا کہتے ہو۔ تم لوگ فاحشاؤں کا بازار بناتے اور چلاتے ہو، عورت

کو کیوں گالی دیتے ہو؟ میرا دھندہ ختم کروگے؟ تم کیا ختم کروگے میں خود آگ لگاؤں گی اب تم سب کے دھندوں کو۔ تیمور اور شموران کو پاس والے کمرے میں بند کردو، دیکھوں کون باپ ان کو چھڑا کر لے جاتا ہے یہاں سے؟ انعم عیسیٰ کے پیسے اس کے منہ میں ٹھونس کہ حرامی کے حلق سے آواز بھی نکل نہ سکے۔ لے جاؤ، ان کو کمرے میں بند کردو اور ان کے ہاتھ پاؤں رسی سے اچھی طرح کس دو اور فون نکال لو جیبوں سے۔"

پھر وہ بڑی تیزی سے دوڑتی ہوئی سکینہ کے کمرے کی طرف گئی اور دروازہ پیٹا۔ سکینہ اے میری سکینہ! دروازہ کھول، دیکھ، تیری سکو مائی آئی ہے۔ بیٹیا دروازہ کھول دیکھ تیری میاّ آئی ہے سکو میاّ!۔

انّا نے جیسے ہی دروازہ کھولا وہ دوڑ کر سکینہ سے لپٹ گئی اور زاروقطار رونے لگی۔ وہ اس کا منہ چومتی جاتی اور کہتی جاتی "مجھے معاف کرنا بیٹیا میں نے تیری محبت، عقیدت اور مان کا اپمان کیا مجھے ماں کہنے اور پہلی بار میاّ کہنے والی تو ہی تو تھی، تو ہی تھی بٹیا، تو ہی۔ میں کیا کرتی مجھے زمانے نے ماں سے رنڈی بنا دیا مگر آج تیری محبت نے مجھے پھر سے ماں بنا دیا ہے میں تیری ہی میا ہوں بٹیا میں تیری ہی میاّ ہوں۔ میں رنڈی نہیں ہوں میں رنڈی نہیں ہوں میں میاّ ہوں میاّ!!" وہ چیختی چلاتی روتی بلکتی سسکتی رہی اور سکینہ اس کے چوڑے سینے میں کسمساتی صدیوں کی ترسی ممتا کا آب حیات پیتی سیراب ہوتی رہی۔

جانے کتنے لمحے گزرے انّا اور انعم، محبتوں کے اس سیلاب کو نہارتے چپ چاپ کھڑے تھے۔ وہ تب چونکے جب سکو مائی دھم سے زمین پر بیٹھ گئی، شاید اس کے حواس جواب دے رہے تھے۔ انا اسکی طرف لپکی اور انعم دوڑ کر پانی لے آیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں زمین پر بیٹھی تھی، ایک پاؤں کی پالتی مارے اور دوسرا گھٹنا کھڑا کئے اس گھٹنے پر کہنی ٹیک کر ہتھیلی پر صبیح چہرہ ٹکائے سکینہ کو تک رہی تھی اور سکینہ کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ نارائن کی جھونپڑی میں نوواری کچھ مارے ساڑھی میں بڑا سا تلک لگائے بیٹھی نارائن کے لئے فکرمند ہوتی اس سے باتیں کرتی رہتی۔ سکینہ کی آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا، وہ سکو بائی کو نہارتی رہی۔ اپنی میاّ کو جس کے چہرے پر کوئی الوہی نور اتر آیا تھا اور شاید تنزیل پوری ہو چکی تھی۔ ابدی محبت کی تنزیل۔

"انعم تو میری سکینہ سے شادی کرے گا؟"

اس کا سوال غیر متوقع تھا انعم ہڑبڑا گیا۔

''ممم میں کیا کہوں می می میاّ'' وہ بہت مشکل سے بولا۔

''انا تم اسے تیار کر دو لہن بناؤ''

''سلیم !''اس نے انٹر کام پر اپنے ڈرائیور کو آواز دی جو اندر کے طوفان سے بے خبر تھا، دوڑا چلا آیا

ابھی حاجی علی کی درگاہ پر جاؤ، چادر چڑھاؤ اور بڑے حافظ جی کو میرا اسلام سناؤ اور ان سے کہو کہ یہاں ابھی چلے آئیں، کسی کا نکاح پڑھوانا ہے۔وہ درگاہ کی بازو والی مسجد میں رہتے ہیں۔

پھر وہ پھرتی سے اٹھی اپنے افس میں بیٹھی جانے کس کس کو فون گھماتی رہی۔

اس نے انعم کو کپڑے لانے کے لئے بھیجا تاکہ وہ دولھا بن سکے پھر وہ اپنے کیبن میں گم ہوگئی۔

رات کے نو بجے کے قریب گاڑی رکی جس میں سہارا دے کر حافظ جی کو اتارا جارہا تھا اور اتارنے والا کوئی خوبرو گبرو باریش جوان تھا۔سلیم ان دونوں کو اندر لے آیا۔آفس کی سیٹنگ بدل چکی تھی۔کرسیاں میز اور صوفے ہٹا کر قالین بچھادیا گیا تھا۔

حافظ جی اندر آئے ایک لمحے کو کانتا لڑکے کو دیکھ کر چونکی ضرور مگر نگاہیں حافظ جی کی نگاہوں سے ٹکرائیں جہاں اثبات تھا پوری ممتا کی شدت سے اس نے دوبارہ نوجوان کو نہارا اور اس کے اندر کی گہری کھائی محبت، سکون، ممتا اور اطمینان سے بھرتی گئی۔

نکاح ہوا۔مبارک سلامت کا شور بھی اٹھا،مگر کانتا کی نگاہیں نوجوان پر جمی رہیں۔باہر کھانے کے لئے جب سب لوگ لے جائے گئے تو اس نے حافظ جی کو روک لیا۔

''یہ!!!!!یہ!!!!''وہ اور کچھ بول ہی نہیں سکی۔سفید شلوار قمیص میں وہ آسمانی حور لگ رہی تھی۔

''ہاں بیٹیا یہ نعمان ہی ہے تمہارا بیٹا۔دسویں کلاس میں پڑھتا ہے۔اور حفظ بھی مکمل کر چکا ہے۔ ملوگی؟''

''نہیں بابا اس کو اسی اطمینان کے ساتھ جینے دو کہ وہ آپ کا ہی بیٹا ہے،اس پر آگہی کے جہنم مت کھولو''

نکاح کے بعد وہ انعم اور سکینہ کو اپنے کمرے میں لے گئی۔لال ہرے نوٹوں کی گڈیاں بھری سوٹ کیس انعم کو دی۔اپنے گہنوں کی تجوری کھولی، سارے زیورات سمیٹ کر سکینہ کے حوالے کئے۔جس نے خواب میں بھی جس کا گمان نہیں کیا تھا۔اناّ سے کہا کہ ایک بکسہ منگوا، کر اس کی ساڑیاں اور لباس بھر کر

سکینہ کو دیدے۔اور اپنا خود کا ضروری سامان سمیٹ لے۔پھر اس نے ایک چابی نکالی۔انعم سے مخاطب ہو کر کہا۔"سنو یہ میرے آبائی مکان کی چابی ہے جو مہاراشٹرا کے دیوگڈھ قصبے میں ہے۔وہاں میں نے سارے انتظامات کر رکھے ہیں، تاکہ اپنی بقایا زندگی وہاں جا کر گزاروں۔مگر سب کچھ اتنی جلدی ہو رہا ہے کہ میں شاید ہی تمہارے ساتھ چل سکوں۔اسلئے تم، سلیم، انّا اور سکینہ کو، لے کر ادھر چلے جانا۔وہیں بس جانا ان پیسوں سے کوئی کاروبار شروع کرنے کی کوشش کرنا۔میری سکینہ اور انّا کا بہت خیال رکھنا۔میری سزا اور انصاف کا عمل پتہ نہیں کتنا لمبا چلے۔تیمور اور شمور دونوں میرے ساتھ رہیں گے۔ہم زندہ رہے تو تم سے پھر کبھی نہ کبھی ملاقات ہوگی۔ابھی تم میری گاڑی لے کر اندھیرے میں نکل جاو۔پھر اس نے مڑ کر سکینہ اور انّا کو گلے لگایا بہت روئی۔حتیٰ کہ دل کا بوجھ ہلکا لگنے لگا۔

رات کے آخری پہر سینٹرل بیورو آف انٹلی جینس (سی بی آئی) کی لمبی گاڑی آ کر رکی۔گھر کی تلاشی ہوئی، ضروری دستاویزات، پیسہ، فون ریکارڈر، لیپ ٹاپ۔الماریوں میں موجود کاغذات سب تحویل میں لے لئے گئے اور ہرن پٹیل، حبشی جوزیف، عیسیٰ کو ایک جیپ میں سوار کرایا گیا اور کانتا کو بیورو چیف کی کار میں لے جایا گیا۔

سکو بائی کے آبائی گاؤں میں جا کر انعم کی کار رکی۔سلیم، سکینہ اور انّا نے جا کر دروازہ کھولا۔انعم اور سلیم نے گاؤں میں دکانداری کی نیت سے بازار کا دورہ شروع کر رکھا تھا۔حسب معمول بھاؤ کاکا کے ڈھابے پر بیٹھے وہ چائے پی رہے تھے۔کاکا نے اخبار بڑھایا، پہلے صفحے پر سکو بائی کی لاش کی تصویر کے اوپر سرخی لگی تھی" شہر کے مشہور صنعت کار شری ہرن پٹیل نے کل رات ایک جسم فروش گروہ کی سرغنہ کو پکڑوانے میں پولیس کی مدد کی۔ریڈ میں کانتا بائی کے دو باڈی گارڈ مارے گئے۔تمام دستاویزات پولیس نے اپنی تحویل میں لے لئے، کانتا بائی ریڈ کے وقت پولیس کی گولی کا شکار ہوئی کیونکہ اس نے پولیس پر گولی چلانے کی کوشش کی تھی" ۔خبر تفصیل سے لگی تھی۔زخمی پوس کارندہ ہرن پٹیل، انٹلی جینس بیورو چیف کی نمایاں تصویروں کے نیچے کانتا بائی اور اس کے باڈی گارڈز کی لاشیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔

پل صراط

مسلسل موسلا دھار بارش کا یہ تیسرا دن تھا۔ ملناڈ علاقہ بارش میں خاصا سرد ہوتا ہے۔ درجۂ حرارت کافی گر جاتا ہے۔ بارش کی وجہ سے نباتاتی اپج کافی گھنی ہوتی ہے اور گھنی اپج میں کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض کی آبادی بھی دوگنا ہو جاتی ہے جن کو بڑھنے کے لئے غذا کی شدید ضرورت ہوتی ہے، بھلے وہ کسی زندہ انسان کا جسم ہی کیوں نہ ہو۔

سینے میں جلن کا احساس نیا تھا، جو پیٹ کی طرف سرکتا جا رہا تھا، پھر لگا انتڑیاں کاٹی جا رہی ہیں کچ، کچا کچ، کسی تیز قینچی سے۔ یہ افتاد کم نہ تھی کہ اسے لگا پیروں پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں، اس کے پیروں کا گوشت کھا رہی ہیں۔ شاید کوئی جونک بھی لگ گئی تھی، بائیں پنڈلی میں شدید درد کی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ وہ خود بھی تو اپنی اولاد کے لئے جونک ہی بن گیا تھا، جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کی اولاد نے اسے حشرات الارض کی غذا بننے کے لئے باہر پھینک دیا تھا۔ ایسے وقت میں وہی ربّ واحد یاد آیا، جو ہماری سانسوں کا خالق، مالک اور ضبط کرنے والا بھی ہے۔ اس کی کراہ نکلی۔ ''اے رب ذوالجلال کس گناہ کی سزا ہے کہ جیتے جی اس حال میں رکھا گیا ہے؟ میں نے تو اپنے والدین کو اس حال میں کبھی نہ چھوڑا تھا'' رب ذوالجلال، پالن ہار، ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا، رحمان و رحیم، جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اس کا فوراً جواب آیا۔ اس پر بھی آگہی کے سارے در کھل گئے۔ منظر در منظر۔

اسے وہ دن یاد آیا جس دن اس کا باپ مر گیا تھا اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے ساری زمین، کھیت اور گھر اس کے نام ہو گئے تھے۔ کسی کے علم میں لائے بغیر اس نے زمین، گھر اور فلور مل، اپنے نام کروالی، جبکہ حق دار اس کی ماں اور ایک بیاہی بہن بھی تھی۔ باپ کی چھوڑی زمین اور ایک فلور مل جس سے ملحق گھر اسے ورثہ میں ملا تھا، جو اس کی بے فکری کا سبب تھا۔ خوبصورت بیوی اور بڑے ہی خوبرو دو بیٹے، جو اسے دل و جان سے عزیز تھے۔ مگر فطرت کے سیلانی کو یہ منظور نہ تھا کہ فلور مل پر ٹھہر کر روزانہ لوگوں کا اناج آٹے میں تبدیل کرے، نہ کھیتوں کی مزدوری ہی اسے بھاتی تھی۔ جیسے ہی بڑا بیٹا کثرت لاڈ اور پیار سے بگڑا دسویں میں فیل ہوا، بطور جرمانہ، اسے فلور مل کی گدی سونپ دی! آدھا کھیت بیچ دیا اور ٹرک خرید لیا۔ سیلانی

طبیعت کو قرار دینے کا اس سے بہتر ذریعہ اسے نہ سوجھا۔اس کا اپنا علاقہ، کثرت بارش، قدرتی مناظر، آبشار، ندیاں، پہاڑ اور بہت نفیس، باریک، خوشبو والے چاول کی پیداوار کے لئے جانا جاتا تھا۔

شہر کے بڑے بیوپاریوں سے چاول کے تھیلے اٹھانا، کبھی منگلور، کبھی گووا، کبھی ممبئی جیسے بڑے شہروں کی منڈیوں میں بیچ آنا، اس نے اپنا نیا پیشہ بنالیا۔اس کے دن بدل گئے۔زندگی کے رنگ ڈھنگ بھی بدلے۔پیسہ جہاں ضرورت سے زیادہ آجائے، تو اس بندے کو جس کے پاس منصوبہ بندی اور خیراندیشی نہ ہو، عیاشیاں ہی در آتی ہیں۔ایک ہی بیوی پر قناعت کرنے والوں میں سے تو نہیں تھا، نیا شہر نئی عورتیں۔ پندرہ، پندرہ دن باہر ہوتا گھر ہفتہ دس دن ہی گزرتے۔بیوی بوڑھی لگتی جس کے پاس من بہلانے کی طوائفانہ ادائیں نہیں تھیں۔اس کا غصہ کسی اور شکل میں نکلتا، نتیجہ بیوی کے چہرے اور بازوؤں پر نیل ابھر آتے۔اور وہ پھر ٹرک لے کر نکل پڑتا۔بیوی اور بچے سکھ کی سانس لیتے۔پتہ نہیں کتنے سال گزرے، بوڑھی ماں اس کی بے اعتنائی کا دکھ سہتی، جوان بیٹی کی موت کا صدمہ لئے، اپنی زندہ بچی، چھوٹی نواسی، کو بہو کی گود میں ڈال کر، ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئی۔

وقت گزرتا رہا، بڑا بیٹا بھی عیاش نکلا۔اس نے اپنی ٹیکسی خریدلی۔پھر وہ بھی باپ کے نقش قدم پر چل نکلا۔

چھوٹے نے روتے دھوتے بی کام پاس کیا سول ہاسپٹل میں اسے ریکارڈ کیپر کی نوکری مل گئی۔

''اب ہمیں لڑکوں کی شادیاں کردینی چاہیں، خیر سے اپنی کمارہے ہیں''۔بیوی نے دبے لفظوں میں کہا۔

اس نے آئینہ دیکھا، چہرے پر کچھ جھریاں تو تھیں بال بھی کچھ سفید ہو رہے تھے''مگر کیا میں بہوئیں لاکر سسر بن جاؤں؟''

اس مرتبہ بال کٹوانے سے پہلے اس نے حجام سے خضاب لگانے کی فرمائش کی تھی، حجام زیرلب مسکرایا۔

وہ پھر اپنی گاڑی لے کر نکل پڑا۔

اگلے پھیرے میں بیوی نے کچھ لڑکیوں کی تصاویر اس کے سامنے رکھ دیں۔

''کوئی دو تو پسند کرلیں، دونوں کی شادی ایک ساتھ کرلیتے ہیں''اس نے نظرانداز کیا۔

جب بیوی بیزاری سے اٹھ گئی تو اس نے ایک، ایک تصویر کو اٹھا کر غور سے دیکھنا شروع کیا، کسی کے گال اچھے تھے، کسی کے ہونٹ، کسی کی آنکھیں تو کسی کے بال، بڑی دیر تک وہ تصاویر سے حظ اٹھاتا رہا اور

اپنی سوچوں میں ان کے خدو خال ابھارتا رہا۔

''کوئی ڈھنگ کی لڑکی ڈھونڈو جو پوری طرح قبول ہو''اس نے ساری تصاویر میز پر پٹخ دیں۔

ہر پھیری پر نیا تماشہ منتظر رہتا، آخر بڑے نے شادی سے انکار کر دیا، شاید کہیں پھنس گیا تھا اور کہہ دیا کہ چھوٹے بھائی کی شادی کر دی جائے۔

''چاول مل کے سوداگروں کے گھر سے آپ کے چھوٹے بیٹے کا رشتہ آیا ہے! چار بیٹوں کے بعد ہوئی ایک ہی لڑکی ہے۔ داماد سرکاری نوکر چاہیے!''

''ایں، ان کے گھر سے؟ کیسے؟!!!!!!!!'' وہ کچھ حیران ہوا، پھر بیوی اور بیٹے کی زبردستی، لڑکی بھی دیکھ آیا۔ لڑکی کو اللہ میاں نے بڑی فرصت میں بنایا تھا، اپنے نام کے مصداق زینت ہی تھی۔ ایسی خوبصورتیاں کم کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس نے ہاں کر دی اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر شادی کی۔

بیوی کو گھر میں نئی بہو ملی، تو اس کی توجہ بٹ گئی۔ بیٹے ویسے بھی اس سے دور دور رہتے تھے۔

سال بھر میں بیک وقت جڑواں لڑکوں کی آمد نے بہو کو مغرور، بیٹے کو بیوی کا غلام اور بیوی کو پوتوں میں مشغول دادی بنا دیا۔ بچپن کی سرحد پار کر جوانی میں قدم رکھتی ثمینہ، اس کی مرحوم بہن کی بیٹی کو گھر کی مفت کی نوکرانی بنا دیا۔ جو کم و بیش، اس کے کھانے پینے، کپڑے دھونے کی ضرورتیں پوری کرتی۔ اسے اب اپنا ہی گھر مہمان سرائے لگتا۔

مگر اس کے معمولات میں تبدیلی نہیں آئی۔

عورت جب نشہ بن جائے تو کوئی اور نشہ اثر نہیں کرتا۔

پچھلی رات اس نے بہت تلاش کے بعد، اپنی بہو جیسی کم عمر اور خوبصورت طوائف کے ساتھ رات گزاری تھی۔ اس پر ایک عجیب سا نشہ طاری تھا۔ کبھی بہو، تو کبھی طوائف نظروں کے سامنے آجاتی۔ مگر ٹرک کا بھرا لوڈ پہنچانا ضروری تھا۔ مستی میں غرق محمد رفیع کے گانے سنتا، وہ اربیل گھاٹ کی پہاڑی کی گہری موڑوں والی خطرناک سڑک پر تھا۔ شام سے پہلے پہلے منگلور پہنچنا تھا۔ کہنہ مشق ڈرائیور تھا۔ گاڑی کی رفتار بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔

مگر! کب بیلنس گیا، کب گاڑی پہاڑی گھاٹ سے لڑھکی، پتہ نہیں چلا۔ کمر میں تیز درد کا احساس آخری تھا۔

آنکھ اسپتال کے بستر پر کھلی۔ دائیں پیر پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا، جو اوپر اٹھا کر باندھ دیا گیا تھا۔

ٹریکشن لگے تھے ہاتھ پر بھی پلاسٹر تھا۔سر بھی پٹیوں سے بندھا تھا۔پورا بدن درد کا منبع بنا ہوا تھا۔سامنے بیوی کا اترا ہوا چہرہ ''یہ کیا منحوسیت طاری کر رکھی ہے''۔اس نے چلا کر بیوی کے تھپڑ رسید کرنا چاہا۔مگر ہاتھ نے فرمانبرداری نہیں کی۔اسے یقین نہیں آیا وہ اتنا بے بس ہے۔طاقت کے نشے میں چور شخص کو اپنی بے بسی پر یقین کرنا مشکل تھا۔نشہ ٹوٹنے کی کیفیت بہت کربناک ہوتی ہے۔

کچھ بہتری لگی تو گھر لایا گیا۔بیوی پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی۔وہ کراہتا تو فوراً چونکتی،کمر سہلاتی،سر سہلاتی،اپنے ہاتھوں سے کھلاتی،قدرتی حاجات سے فارغ کرواتی،اسفنج باتھ دیتی۔آٹھ دن میں ایک مرتبہ بیٹا باتھ روم میں وہیل چیئر پر لے جا کر نہلاتا۔تکلیف تو تھی،مگر لگا بیوی بچوں کو پالنے میں جو رقم لگی ضائع نہیں گئی۔کھانا دیتے وقت،کبھی کبھی بہو کمرے میں آتی تو آنکھوں کو سکون ملتا۔کبھی کبھی سکینہ بھی تیمارداری کر لیتی،اس کے ہاتھ کا لمس بھی بہت بھلا لگتا۔

مگر اس بے چینی کا کیا کرتا جو نشہ اور لت بن گئی تھی۔

کسی خوبصورت عورت کو دیکھے،کافی دن گزر گئے تھے۔بہت افسوس ہوتا کہ اس نے دھیان سے گاڑی کیوں نہ چلائی۔مگر اپنے ہی بڑھتے،سفید ہوتے بال نوچنے اور بیوی پر غصہ نکالنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔وہ بہت چڑچڑا ہو رہا تھا۔ایک دن حسب معمول غلاظت اگلتی زبان،شاید بڑے بیٹے نے سن لی اور چلا اٹھا۔

''خبردار جو اماں کو گالی دی۔وہ غلاموں کی طرح خدمت کر رہی ہے اور آپ بدلے میں گالیاں دیتے ہیں!شرم نہیں آتی!انسان ہیں کہ حیوان۔''

ایک منٹ کے لئے سن ہو گیا۔کبھی سامنے نہ ٹھہرنے والی اولاد آج اسے آنکھیں دکھا رہی تھی۔زندگی کا یہ رخ نہ صرف نیا،بلکہ جان لیوا تھا۔پھر اس نے اپنا آپا کھو دیا اور مغلظات کا طوفان ابل پڑا۔ساری کرنی دھرنی اولاد کو سنا دی،اور فوراً عاق کا حکم نافذ ہو گیا۔بیٹے کو گھر چھوڑنے کا حکم دیا۔خود اسے دوبارہ اسپتال داخل ہونا پڑا۔

گھر واپسی کے بعد اس نے بڑے بیٹے کو نہیں دیکھا،البتہ بہو کے منہ پر عجیب رونق اور مسکراہٹ دیکھی۔اس کے چہرے کی کھلی روشنی دیکھ وہ بہت خوش ہوا،اس خوشی میں بیوی کی آزردگی اسے دکھائی بھی نہ دی نہ اس کی کمزور ہوتی صحت ہی۔

انہی دنوں ثمینہ کا رشتہ لگا اور اس کی بیوی نے اس فرض سے سبکدوش ہونے میں دیری نہیں کی۔

گھر بیٹھے بیٹھے وہ بہت بیزار ہو گیا تھا۔ ٹرک تو دوبارہ کھڑا نہ ہو سکتا تھا سو بیچ باچ کر، انشورنس کی رقم سے اس نے کسی طرح اپنی فلور مل شروع کروالی۔ سارا دن فلور پر آتی جاتی کم عمر لڑکیوں کو تاکنا، بڑھتی عمر کی نئی عورتوں کے ساتھ، ذومعنی جملوں میں بات کرنا، اس کی ذہنی عیاشی کا نیا ذریعہ بن گیا۔ کچھ ایک عورتوں کو، آٹے کا تھیلا پکڑانے کے بہانے، چھو بھی لیتا، کبھی ہاتھ دبا دیتا۔ مگر باسی کڑھی میں آتے ابال کو ٹھنڈک نہ ملتی۔

گھر میں اس کی مصیبت کے دن شروع ہوئے، کیونکہ اس کی وہی بھانجی ثمینہ، اچانک بیوہ ہو کر، انہی کے گھر پناہ لینے پھر سے آ گئی تھی۔

جوان بیوہ بھانجی اور بہو کو دزدیدہ نگاہوں سے تکنا اب عادت ثانیہ بن گئی تھی جسے اس کی کمزور بیوی اکثر پکڑ لیتی اور نگاہوں سے تنبیہہ بھی کرتی مگر اس کی کب چلی تھی، جواب چلتی۔۔۔۔

اس کی ہوس کا شیطان پھر سے سر اٹھانے لگا، جسے وہ ہزار کوششوں کے باوجود روک نہیں پا رہا تھا۔

ساون کا مہینہ، موسلا دھار بارشیں، پون کا شور، بجلی کی آنکھ مچولی، کبھی کبھی اندر کی گرمی اور سانسوں کی رفتار کو، خواہ مخواہ بڑھاتے ہیں۔

ایک ایسی ہی موسلا دھار بارش کی شام تھی، بہو اور بیوی، بچوں کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئیں تھیں۔ بجلی بھی نہ تھی کہ مل پر بیٹھتا، سردی محسوس ہوئی تو چائے کی طلب نے اس کو گھر کے اندر داخل کروایا۔ اس کی آواز پر ثمینہ چائے لے کر آئی، چائے ختم کر کے اس نے دوبارہ اسے آواز دی، جب وہ آئی تو اس نے اسے دبوچ لیا۔

گھر میں ہنگامہ برپا ہوا، بہو، بیٹے اور بیوی نے لعنت ملامت کی، مگر بات ایسی نہ تھی کہ باہر کہی جاتی۔ بیٹے نے اس مشکل کا حل یوں نکالا، کہ ثمینہ کا نکاح کسی طرح سے اپنے دفتر کے ایک رنڈوے سے کروا دیا جس کی بیوی، اس کی چار بیٹیاں چھوڑ کر، جنت سدھار گئی تھی۔

شیر کے منہ سے نوالہ چھین لیا جا چکا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی اندر سے مردہ ہو رہی بیوی جھنجھوڑی جاتی رہی۔ آخر ایک دن وہ بھی بے جان ہو گئی۔ بڑا بیٹا ماں کی میت پر آیا، تدفین کے بعد جانے کو تیار ہوا تو چھوٹے بھائی نے باپ کی کہانی سنائی اور اسے ساتھ لے جانے کی التجا کی ”مجھے جب عاق کیا گیا تھا، تب

باپ بوجھ نہ تھا کیا؟ میں کیوں لے جاؤں، تم خود بھگتو‘‘ پھر وہ بھی چلا گیا۔

فلور مل کی مصروفیت کے بعد اگر کچھ موقع ملتا تو بہو کو نہارنے میں گزرتا، مگر اندر کا حیوان جاگ اٹھتا، ثمینہ کے ساتھ ہوئے واقعہ کے بعد، جو بے عزتی لعنت ملامت ہوئی، وہ اسے روکتی۔ بہو بڑے گھر کی بھی تھی، خوف بھی آتا مگر اندر کا شیطان کبھی نہ کبھی سر اٹھاتا ہی رہتا۔

ایک دن اس نے بیٹے سے بات کرنے کی ٹھانی۔

’’تمہاری بیوی کو اپنے بچوں سے فرصت نہیں ملتی، اس کے پاس میرے لئے وقت نہیں ہے، مجھے دوسری شادی کرنی ہے۔ کوئی بیوہ یا طلاق یافتہ ڈھونڈ دو‘‘ بیٹا بہو اس نئی افتاد سے پریشان ہو گئے۔ ’’اس عمر میں آپ کو کون اپنی بیٹی یا بہن دے گا‘‘ بیٹے نے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’کیوں نہیں دے گا۔ میں خود کفیل ہوں! یہ گھر میرا ہے! اور کھیت بھی موجود ہے، مجھے دوسرا نکاح کرنا ہی ہے، تم کوئی عورت ڈھونڈ دو۔ وہ غرور سے ہر لفظ چبا چبا کر بول رہا تھا۔ اس کے صاحب جائیداد ہونے کا غرور بول رہا تھا۔

بیٹے کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی اور اس نے ہاں ہوں، کہنے میں عافیت محسوس کی۔

بوڑھے کا تقاضہ جب بڑھ جاتا تو بہو کچھ توجہ دیتی اور کچھ اچھا کھانے کو مل جاتا، بہو ہنس کر بول لیتی تو وہ کچھ دن کے لئے خاموش ہو جاتا۔

مگر بہو کا اس طرح ہنس بولنا، اس کی غلط فہمی کو بڑھاوا دیتا رہا کہ وہ بیٹے اور بہو کو ڈرانے میں کامیاب ہو گیا ہے، جس سے آئے دن اس کی ہمتیں بڑھنے لگیں۔

برسات کی رم جھم شامیں بہت ظالم ہوتی ہیں۔ وہ بوڑھے انسان کو، اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ ابھی بہت توانا ہے اور اپنے اندر کی آگ کسی بھی طرح بجھا سکتا ہے۔ شیطان نے پھر ہلچل مچائی اور اس نے گھر میں موجود، اکیلی بہو پر جھپٹا مارا۔ کھائے پیئے گھر کی توانا و بے خوف عورت کا ہے کو قابو آتی!!!!! وہ شیرنی کی طرح دھاڑی، پلٹ کر جو اس نے لات جھاڑی تو وہ زمین پر گر گیا اور اس نے بوڑھے پر مکوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔

زمین پر گرتے ہی، پھر ٹانگ کی ہڈی، وہیں سے ٹوٹی، جہاں پہلے آپریشن کے بعد راڈ ڈالی گئی تھی۔

ذبح ہوتے جانور کی طرح وہ اس وقت تک چیختا رہا، جب تک بیٹا ایمبولنس لا کر اسے دواخانہ نہ لے گیا۔ ڈیڑھ مہینہ، ہسپتال کے بستر پر پڑے پڑے، کبھی میل، کبھی فی میل نرسوں کی، تیمارداری کا لطف اٹھاتا پھر جیسے تیسے ٹھیک ہوگیا۔ مگر وہیل چیر مقدر بن گئی اور زندگی عذاب۔ کئی کئی دن نہلائے جانے کے انتظار میں پڑا چیختا رہتا۔ آمدن کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ بہو نے مفت کی روٹی توڑنے کے طعنے دینے شروع کردیئے، تو اس نے بیٹے سے مانگ کی کہ فلور مل بکوا دے۔ بہو کے بھائی نے فلور مل خرید لی۔ پیسے کچھ ہی دنوں میں خرچ ہوگئے۔ پھر کھیت کی باری آئی۔ وہ بہو کے دوسرے بھائی نے لے لی۔ پھر گھر بک گیا۔ بہو بیٹا گھر خالی کرکے جانے لگے تو وہ گڑگڑانے لگا کہ اسے بھی ساتھ لے جایا جائے۔ غرور سے اٹھا رہنے والا سر، بہو بیٹے کے قدموں میں تھا۔ بیٹے نے ہزار شرطیں لگائیں اور ساتھ لے گیا۔ نئے گھر میں، ایک چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں، اسے جگہ ملی۔ دو وقت کا کھانا، کوئی پوتا یا پوتی دے جاتے اور وہ انسان سے گفتگو کو ترستا چیختا رہتا۔

زندگی بھر کھایا پیا انسان، جس نے بیوی بچوں کو رعایا بنا کر راج کیا ہو! اسے قید تنہائی کب بھاتی ہے؟

بے چین دل نے ہلچل مچادی اور اس نے وہیل چیئر لے کر باہر جانے کوشش کی تو چیئر لڑھک گئی اور وہی ٹانگ پھر سے ٹوٹ گئی۔ اب بیٹا نہ دواخانہ لے جانے پر راضی تھا نہ خرچ کرنے پر۔ آپ کے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ پھر سے واپس اسے اسی تنہا کمرے میں پھینک دیا گیا۔ جہاں وہ جانوروں کی طرح چلاتا پڑا رہتا۔

اس کا بڑا پوتا احمد کبھی کبھی اس کے پاس آجاتا، پھر اپنی ماں کی آواز پر پلٹ جاتا۔ کمرہ بدبو سے بھر گیا تھا۔

بارش کا سرد دن، بیٹا جیسے ہی نوکری کے لئے نکلا، بہو نے ملازمہ کی مدد سے، اسے گھر کے باہر بنے چبوترے پر پھنکوا دیا اور ایک عارضی چھت کا سایہ بنوا دیا کہ وہ بارش سے بچا رہے۔ بہت چلاتا تو کھانا ملتا ورنہ وہیں پڑا رہتا، اس کی اپنی ناک کی حس بھی خود اس کی اپنی بدبو کی عادی ہوگئی تھی۔ مگر ایک تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ راستے کے آتے جاتے لوگ اسے چبوترے پر پڑا دیکھ، چہ میگوئیاں کرتے اور اس کے بہو بیٹے کو گالیاں دیتے ”کیسی ناخلف اولاد ہے بوڑھے کو باہر پھینک رکھا ہے!!“ اس کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑتی، پھر وہ کچھ اور زور سے کراہتا، کبھی کبھی تو رونے اور معافیاں بھی مانگنے لگتا۔

آج شاید اس کی بہو کو کچھ، اس پر رحم آیا تھا۔ اس کے کہنے پر بیٹے نے اس کی صفائی کی تھی، لباس بدلا تھا اور گھر میں بنا میٹھا بھی لا کر کھلایا تھا۔ کھانے کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ وہ پورا نہ کھا سکا تھا۔ بچا کھانا بیٹے نے اس کتے کو کھلا دیا تھا، جو پچھلے کچھ دنوں سے، اس کا ساتھی اور کھانے کا شریک بن گیا تھا۔ پھر بیٹا اندر چلا گیا اور اس نے دروازہ بند کرلیا۔

کھانے کے کچھ ہی دیر بعد اس نے سینے میں تیز جلن اور بے چینی محسوس کی، رفتہ رفتہ اپنے زخموں کے درد کو، ہلکا ہوتا محسوس کیا۔ اندر کی آگ بڑھتی رہی۔

''یہ مجھے آج کیا ہو رہا ہے۔ ایسی جلن کبھی نہیں ہوئی، رب ذوالجلال میں نے بہت گناہ کئے ہیں! مگر تو رحمان و رحیم ہے! میرے گناہ تیری رحمانیت سے زیادہ نہیں ہیں! میں نے سوال کیا اور تو نے مجھے اپنی ہی زندگی کے پل صراط سے گزار دیا! مالک میں گناہ گار! خطاوار! شرمسار ہوں! مجھے اپنی پناہ میں لے لے'' تیز جھماکا ہوا۔ بجلی کوندی۔ لگا اس پر ہی گر پڑے گی۔ مگر بجلی کی روشنی میں اس نے پاس پڑے کتے کو دیکھا جو بے جان تھا جس کے منہ سے جھاگ نکل کر زمین پر پھیل گیا تھا۔ اسے یاد آیا کل صبح اس کی بہو کہہ رہی تھی۔

''آتے وقت میونسپلٹی سے، کتے مارنے کا زہر لیتے آنا، بارش میں آوارہ کتوں نے ہمارے آنگن کو پناہ گاہ بنالیا ہے''۔

''تو کیا بہو نے مجھے بھی!!!؟؟؟'' ۔اچانک اسے قے ہوئی اور پیٹ کی ساری جلن بدبودار سیال کی شکل باہر آئی، ساتھ میں اس نے خون کا ذائقہ بھی محسوس کیا۔ سوال کرتا ذہن اندھیروں میں اترنے لگا۔ پل صراط کا آخری نقطہ۔ اگلا پل۔ خلا تھا۔ بھاری جسم نیچے گرنے لگا۔ گرتے گرتے۔ صدیاں بیت گئیں۔ پھر اسے لگا وہ روشنی سے زیادہ ہلکا، روشن ہوا، اوپر اٹھتا چلا گیا۔

مکھوٹے

''زرین اٹھو! کتنی دیر پڑی سوتی رہوگی! میں نے کل ہی کہہ دیا تھا کہ آج آفس میں انسپکشن ہے، مجھے جلدی نکلنا ہے''، جھلاہٹ بھری آواز نے اسے جگایا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھی ''جی جی ابھی سب کئے دیتی ہوں'' عاجزی سے کہتی ہوئی وہ کچن مین داخل ہوئی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر اس نے امجد کا ناشتہ اور ٹفن تیار کر دیا۔

''یہ روٹیاں اتنی سخت کیوں ہیں آج ؟ آٹا رات میں گوندھا نہیں تھا کیا؟ کیا کرتی رہتی ہو شام سے؟''

جھلاہٹ کے مارے وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ، ٹفن میز پر پٹخ کر چلا گیا۔ جاتے جاتے ڈھیروں مایوسیاں اور دکھ اس کے چہرے پر چھوڑ گیا۔

''مما ہمارا ناشتہ اور ٹفن؟'' وہ دونوں اس کے پاس کھڑے تھے۔

''ارے واہ تیار؟ آجاؤ میز پر'' اس کی آواز میں شہد ٹپکا مڑنے سے پہلے اس نے آنسو پونچھ لئے۔

''مما یہ روز روز کی روٹی۔ ہمارے دوست روز نیا نیا لاتے ہیں'' ببلو کی شکایتی آواز اٹھی۔

''ارے میرے راجا یہ روٹی ہی آپ کو سب سے زیادہ توانا بناتی ہے۔ بریڈ جام اور میگی میں کیا رکھا ہے۔ آپ اسکول میں سب سے تندرست بچے ہو کہ نہیں؟'' اس کی آواز میں لاڈ دلار پچکار اور یقین تھا۔

''میڈم آج ان بلز کو کسی طرح جانا ہے آپ کے دستخط پینڈنگ پڑے ہیں'' اشوک اس کے دفتر کا کلرک اس کے سامنے فائلوں کا ڈھیر لئے کھڑا تھا۔

''اشوک ان کو یہاں رکھ دو، دو پہر تک دستخط ہو جائیں گے'' اس کی آواز میں ہلکی تنبیہ اور سختی تھی۔

''جی میڈم جی''! اشوک کا لہجہ اس بار دھیما تھا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔

''زرین مجھے آج آفس سے لوٹتے دیر ہو جائے گی، بچوں کو اسکول سے لیتی جانا، اپنی آفس کی دنیا میں مگن نہ رہنا! بھلکڑ عورت!'' فون پٹک دیا گیا۔

''امجد کا صبح کا غصہ ابل رہا تھا فون رکھتے ہوئے۔ بہت مشکل سے اس نے اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپایا اور سامنے بیٹھی ماتحت کی طرف دیکھ کر متانت سے مسکرائی اور گویا ہوئی ''sorry continue please!!!''

اس کی بات ختم ہوتے ہی اس نے کہا ''ایسا کرتے ہیں ٹھیک تین بجے ایک میٹنگ بلاتے ہیں

اور اس مسئلے کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں"۔

"Is that ok؟" وہ مسکرائی۔ متانت سے اپنی ماتحت کو رخصت کرتے ہی اس نے اپنے سامنے کی فائلیں کھول لیں۔

جو بلی اسکوائر پر سگنل کی سرخ بتی اسے پریشان کر رہی تھی۔ بے چینی سے اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور جیسے ہی بتی پیلی سے ہری ہوئی وہ زن سے اپنی گاڑی نکال لے گئی۔

"مما آج آپ آئی ہیں؟" بچے اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔

"ہاں آج چینج کے لئے مما آئی ہیں۔ چلیں؟" وہ دونوں بچوں کو سمیٹتے ہوئے کار کی طرف بڑھی اس کے دل میں ہلکا سا سکون اتر رہا تھا، چہرے کا تشنج کھل رہا تھا۔

"مما آج گول گپے"، بنٹی کی چیخ سے اس کے بریک لگتے لگتے رہ گئے۔

"نہیں آج نہیں اور اس ٹریفک میں تو بالکل نہیں" اس نے پیچھے مڑے بغیر حتمی انداز میں کہا۔ کار کے شیشے میں منہ بنائے بچوں کو دیکھ اس نے بائیں ہاتھ سے بوسہ اچھالا اور ہنس پڑی۔

کچن کی صفائی کرتی وہ ملازمہ سے مخاطب تھی۔

"شاکرہ ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ، آج صاحب ناراض ہو کر گئے ہیں، آج کچھ خاص بنانا ہے"۔

کھانے کی میز پر کھل کھلاتے بچوں اور امجد کو دیکھ کر اس کے اندر ڈھیروں سکون اتر آیا اس کے چہرے پر طمانیت تیر رہی تھی۔

رات دس بجے وہ سجدہ ریز تھی اور دن بھر کی تھکن، فکر، پریشانی، مایوسی، جھنجھلاہٹ، خوف گھبراہٹ، بے چینی، طمانیت، سکون، آنسو بن کر باہر نکلتے رہے۔

"زرین کہاں ہو اور کتنا انتظار کرواؤ گی؟" امجد کا "انتظار" اسے آواز دے رہا تھا۔

اس نے سجدے سے سر اٹھایا، جھٹ پٹ وارڈ روب کھولا، میرون کلر کی سیلکن نائٹی تھامی، واش روم میں گھسی۔ تھوڑی دیر میں وہ سجی سنوری خوشبو بکھیرتی امجد کے پہلو میں تھی۔ مگر دل اندر سے کہیں اداس تھا۔ تھکن سے چور جسم ڈیوٹی پر حاضر تھا، ذہن اس سوچ میں ڈوبا تھا کہ کل کا پریزنٹیشن تو تیار کرنا ابھی باقی ہے۔

پھالگنی (بہار آفرین)

اپنے بابا کا ہاتھ پکڑے وہ بڑے شاہانہ انداز میں چل رہی تھی۔ زمیندار کی بیٹی، شاہی چال اُس کا شیوہ غرور حق اور تھا۔ تھی تو سات ہی سال کی، مگر چہرے پر وقار، متانت اور سنجیدگی بڑوں کی سی تھی۔ اُٹھان بھی غضب کی۔ ابھی سے لگ رہا تھا بارہ تیرہ کی ہے۔ زمیندار بھی متانت والے انسان تھے۔ مگر زمینداری کا رعب اور دبدبہ ہمیشہ چہرے پر قائم رہتا، صبح سویرے جب وہ مندر کو نکلتے تو ہر کوئی اپنی راہ لے لیتا۔ یا داباً اُن کو دیکھ کر راستے سے ہٹ جاتا۔ جب اُن کی سواری گزرتی یا وہ پیدل نکلے ہوں، تو پھر راستے پر لوگ دکھائی نہ دیتے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ عموماً مندر وہ پیدل ہی جاتے، جب دیر ہوتی تو گھوڑا گاڑی پہ دکھائی دیتے۔ دیر ہو یا سویر۔ پیدل ہو یا گھوڑا گاڑی پھالگنی ہمیشہ ساتھ ہوتی۔

پھالگنی کو تکنا اُس کا روز کا معمول تھا۔ وہ روزانہ اپنے باپ کے ساتھ راستہ صاف کرنے نکلتا۔ پنچایت کی طرف سے ہمیشہ اُس کے باپ کی باری مندر کا راستہ صاف کرنے کی ہوتی۔ زمیندار کے نکلنے سے پہلے وہ دونوں باپ بیٹا راستہ صاف کرنے نکل پڑتے۔ جب زمیندار کا گزر ہوتا تو راستہ چھوڑ کر، ادب سے جھک کر کھڑے ہو جاتے زمیندار کا موڈ اچھا ہوتا، تو کبھی کوئی نوٹ ہوا میں لہراتا اور اُن کی طرف پھینکا جاتا۔ جسے وہ بھگوان کا پرساد سمجھ کر سمیٹ لیتے گردنیں اس احسان کے تلے مزید دب جاتیں۔ وہ سوریہ تھا۔ باپ نے بڑے ارمانوں سے اُس کا نام سوریہ رکھا تھا وہ مقدر بھی سورج کا ہی تھا۔ صبح سویرے اُٹھنا اور کام کرنا، جیسے سورج سب سے پہلے اُٹھ کر لگ جاتا ہے۔ چھوٹا تھا، تو بڑے لاڈ پیار تھے۔ پانچ کا ہونے کو آیا تو سرکاری اسکول میں بھیج دیا گیا۔ مگر اُسے شوق تھا کہ وہ باپ کے ساتھ راستہ صاف کرے۔ کیونکہ کبھی جب وہ جاتا تو زمیندار پیسے ضرور دیتا۔ اب اُس کا یہ شوق لت بن گیا کہ، زمیندار سے سکّہ ضرور لے جو اُس کے اپنے ہوتے۔ نوٹ تو باپ لیتا، روپیہ دو روپیہ اُس کا اپنا ہوتا۔ روزانہ کا مشغلہ سالوں پر محیط ہو گیا۔ باپ کی کمر غریبی اور مزدوری نے جھکا دی۔ اُس کا سینہ بغاوت نے تنا دیا۔ اب روپیہ دو روپیہ شوق تھا نہ لت، بلکہ کام اور مجبوری تھی۔ سردی کی صبح باپ کھانستے کھانستے اُٹھتا، جھاڑو اُٹھاتا تو وہی کہتا بابا رہنے دو میں کر لوں گا۔ شوق بدل گیا تھا۔ پھالگنی کو دیکھنا، اُسے نہارنا محسوس کرنا، اس کی لت بن گئی۔ زاویہ نگاہ بدل گیا۔ شوق بدل گیا، کام وہی تھا۔ پھالگنی وقت کے ساتھ نکھر گئی تھی۔ وہ سرکاری اسکول سے گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا۔ علی الصبح اُٹھنا

اور مندر کا راستہ صاف کرنا۔ پھالگنی کو دیکھ کر اپنی صبح خوشگوار بنانا پھر کالج کو دوڑنا اُس کا معمول تھا۔

وہ بلا کا ذہین تھا۔ نچلی ذات کا تھا تو کیا ہوا؟ پڑھائی میں ہمیشہ اول رہتا۔ پچھلے سال شہر سے اُس کے ماما آئے، اُنھوں نے جب سنا کہ وہ اسکول بھر میں اول آیا ہے تو ماما نے اصرار کیا کہ اُن کے ساتھ شہر چلے، مگر اُس نے منع کر دیا۔ وہ پھالگنی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ سورج کو دیکھ کر سب کی صبح ہوتی مگر اس کی صبح پھالگنی سے ہوتی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ پھالگنی بڑی ہونے کے بعد روزانہ آتی۔ کبھی کبھی آتی۔ مگر شام میں سہیلیوں کے ساتھ ندی کے کنارے ٹہلتی ضرور نظر آجاتی، دونوں کے درمیان جانے کون سی ڈور تھی۔ صبح نہ نظر آتی، دن بڑا بیزار کن ہوتا۔ شام میں نظر آتی، رات سہانی ہو جاتی۔ بس ایک احساس، ایک سرور، ایک روحانی خوشی تھی جو اُسے ملتی۔

ورنہ اس کا اور پھالگنی کا کیا میل؟ کہاں وہ سندر سی البیلی، نرم و نازک دوشیزہ، زمیندار کی بیٹی نازوں میں پلی اور کہاں وہ کالا کلوٹا، راستہ جھاڑنے والا مزدور کا بیٹا سوریہ، سورج کی طرح جلنا اس کا مقدر تھا۔

مگر ان جذبوں کا احساسات کا، خیالات کا سوچوں کا کیا کریں۔ کالے کلوٹے مزدور کے احساسات تو دوسرے نہیں ہوتے۔ بس وہ تھا اور اُس کے خوابوں کی اچھوتی دنیا جہاں پھالگنی کے مختلف عکس اور رنگ ہوتے اور وہ بس اُسے نہارتا رہتا۔ گویا نہارنا ہی اس کی عبادت و ریاضت تھی۔ بس کچھ اور نہیں۔

کل اماں کو کچھ کہتے اُس نے سنا! وہ اُس کے بابا سے مخاطب تھی۔

''سوریہ کے بابو سنا تم نے پھالگنی کا رشتہ آیا ہے۔ پڑوس کے گاؤں کے زمیندار کا بیٹا وشنو اُس سے بات پکی ہوگئی ہے۔ شاید کل پرسوں شگن آجائے''۔

کھن سے کچھ ٹوٹا۔ بہت زور سے کچھ گرا۔ پل بھر میں وہ زمین پر آگیا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ رات بڑی بے چینی سے کٹی۔ صبح اندھیر منہ وہ مندر کی اور نکل پڑا۔ مندر کی سیڑھیوں پر جھاڑو لگاتے ہوئے اُسے بھگوان سے پہلی بار شکایت ہوئی۔ ''برسوں تیرا راستہ اور تیری سیڑھیاں جھاڑنے کا یہی صلہ ہے۔؟'' جس بھگوان سے اُس نے کبھی کچھ نہیں مانگا، اُس سے شکایت تھی۔ سوریہ کو سورج کا انتظار تھا۔ ''ارے آج یہ صبح کیوں نہیں ہو رہی؟''

پھالگنی کو دیکھنے کی آس!

بس ایک نگاہ کی آس!

آج آجائے!

کل بھی نہیں آئی تھی!

جانے کہاں ہے؟

کیا اُسے بھی یہی احساس ہے؟ احساس ہوتا تو شام میں ندی کنارے ٹہلنے نہیں آتی؟

یہ میں ہی کیوں ایسا ہوں؟ یہ دل! اس میں یہ آگ کیوں ہے؟ آنکھوں کا کھارا پانی اُس کے چہرے کی دھول دھو رہا تھا۔

مندر کی گھنٹی بجی! وہ چونکا۔

''سوریہ ایسے کیوں مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہے اُٹھ:

زمیندار کی آواز گرجی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کیا ہوا؟ لچھّو کہاں ہے تمہارا بابا؟''

''کئی دن سے دکھا نہیں؟''

''ان دا تاوہ بیمار ہے، آج میں جلدی آگیا تھا'' وہ ہکلایا۔

''ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے... یہ لو''۔

پہلی مرتبہ زمیندار کے ہاتھ میں اُس نے پچاس کا نوٹ دیکھا۔

''شام تک حویلی کا آنگن صاف ہو جانا چاہیئے اور سامنے کا راستہ بھی۔ کل پھالگنی کا شگن آرہا ہے۔ خبردار کہیں کوئی پتھر کانٹا باقی نہ رہے۔''

''جی صاحب!'' بس وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

''حویلی جاؤں! آنگن اور راستہ جھاڑوں؟'' بغاوت نے سر اُبھارا۔ ''میری جوتی!'' یہ اس کی تعلیم اور جوانی بول رہی تھی۔

''شاید پھالگنی کی ایک جھلک دکھ جائے'' دل نے سرگوشی کی۔ اُس کے چہرے پر مسکان کھلی، دل نے عقل پر فتح پائی، وہ گھر کو بھاگا۔ بابا کو سنانے۔

''زمیندار نے ہمیں جھاڑو لگانے کا کہا ہے''؟ اُس کے باپ کو یقین نہیں تھا۔

''ہاں بابا یہ دیکھو پچاس روپے بھی دیئے ہیں'' اس نے وہ نوٹ لہرایا۔

کھانستا، بسورتا بابا اُٹھ کھڑا ہوا۔ نوٹ کی گرمی نے جان بھر دی۔

''چل چل، جلدی چل صاحب ناراض نہ ہو جائے۔''

دونوں سارا دن کوڑا کرکٹ صاف کرتے رہے۔ دوپہر میں کھانا آیا، ملازمہ لے آئی۔ اس کی ٹٹولتی نظریں حویلی کے کھلے دروازے کو تکتی رہیں۔ شاید پھالگنی نظر آجائے۔ مگر۔ پھالگنی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔

صبح کی طرح شام بھی اندھیاری ہی رہی۔ تھکن سے چور! جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ شاید پھالگنی کی ایک جھلک اُسے سکون دے جاتی۔ نیند آنی تھی نہ آئی۔ بابا بازو پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اماں کی کھانسی کبھی خاموشی توڑ دیتی۔

وہ دھیرے سے اُٹھا، دروازے کی کنڈی کھولی۔

''کون ہے؟'' امّاں کی آواز آئی۔

''میں ہوں امّاں'' اس نے تسلی دی۔

''کہاں جا رہا ہے؟ نیند نہیں آ رہی کیا؟''

''بس اماں باہر ہو کر آیا'' وہ تیر کی طرح نکلا۔

''جلدی آئیو۔ کنڈی لگا کر جائیو! دھیان سے''۔ اماں کی آواز دھیمی ہوتی گئی۔

حویلی کے سناٹوں میں ایک مردانی آواز اُبھری۔

''پھالگنی! پھالگنی! کہاں ہو!''

وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ کیا یہ وہی ہے! ''سوریہ''۔ کیا اُس نے میرے دل کی آواز سن لی۔ کہیں میرے کانوں کا دھوکہ تو نہیں! کیا میں حواس میں ہوں؟ اُس نے اپنے بازو میں چٹکی بھری۔ ''سی'' درد تو ہو رہا ہے۔

وہ تیزی سے آواز کی طرف لپکی۔ اندھیرے میں بس اُس کے سفید موتی جیسے دانت ہی نظر آ رہے تھے۔ ''سوریہ کیا تم ہو'' اُس نے خود کو یقین دلانے کے لئے پوچھا۔

''ہاں پھالگنی میں ہی ہوں'' وہ رونے کو تھا۔

''تم صبح مندر کیوں نہیں آئیں!'' بس آوازیں ایک دوسرے کو محسوس کر رہی تھیں۔ ہلدی، ابٹن اور مہندی کی خوشبو نے اُس کے پورے حواس جگا دیئے۔ وہ کھڑکی کے اُس پار کھڑی تھی۔

''کل میرا شگن آئے گا۔ باہر کیسے آتی'' وہ مشکل سے بول پائی۔ کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا نہ عہد و پیمان

باندھے نہ اقرار کیا پھر یہ آواز میں لڑکھڑاہٹ کیوں تھی!

''تم بیاہ کرو گی؟''اس کی آواز میں کئی سوال تھے!

''اور کیا کروں!'' کئی سسکیاں ایک ساتھ اُبھریں۔

''تم چلی جاؤ گی پھر میں تمہیں کیسے دیکھوں گا؟ تم مت جاؤ پھالگنی'' وہ رونے کو تھا۔

''تم جاؤ کسی نے دیکھ لیا تو مشکل ہو جائے گی'' شاید وہ ہوش میں آئی۔

''او پر کون ہے؟'' نیچے سے کرخت آواز گونجی۔

''سوریہ بھاگ جاؤ'' وہ دبی دبی آواز میں چیخی۔

چور! چور! حویلی سے شور اُٹھا۔وہ دھڑام سے گرا۔

''ارے یہ تو سوریہ ہے۔حرام خور کیا کر رہا تھا یہاں!''

زمیندار نے اُسے جوتوں کی نوک پر رکھ لیا۔

''اتنا مارو کہ مر جائے گندی نالی کا کیڑا۔اس کی یہ ہمت!'' زمیندار کا غصّہ آپے سے باہر اُبلا پڑ رہا تھا۔ سوریہ کا روزانہ تکنا اُسے اب سمجھ میں آ گیا۔لوگوں نے سمجھا وہ مر گیا۔ندی کے کنارے پھینک آئے۔

زمیندار نے اعلان کیا۔پھالگنی کا بیاہ آج ہی ہوگا۔وہ نہیں چاہتے تھے اس واقعہ کی خبر پھیلے اور پھالگنی کا بیاہ ٹوٹ جائے اور ان کی پگڑی اُچھالی جائے۔عنقریب پنچایت کے الیکشن ہونے والے تھے۔

مندر میں پھیرے لیتی پھالگنی نے ایک ہی دعا مانگی۔

''بھگوان میری ساری عمر! میری ساری خوشیاں! میرے سارے سپنے! سوریہ کو دے دینا! مجھے کچھ بھی نہ دینا۔اُس کے سارے غم مجھے دے دینا! بھگوان! وہ سسک سسک کر پیا گھر چلی گئی۔

باپ کی عزت اور پگڑی جذبات سے بڑی ہوتی ہے۔ایک اور بیٹی بلی چڑھ گئی۔

وقت نے کروٹ بدلی۔

زمینداری نہ رہی۔شاید بھگوان نے اس کی سن لی تھی۔اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔نہ وشنو تھا۔نہ زمیندار سسر، نہ باپ، نہ حویلی بس دو ایکڑ کی زمین رہ گئی تھی۔جس پر پنچایت کا صدر دانت گاڑے بیٹھا تھا۔سب کچھ تو چھن چکا تھا۔بس یہ دو ایکڑ زمین رہ گئی تھی۔

جو باپ نے مرتے وقت اُس کے نام کی تھی۔کاغذات تھے۔وہ ضلع کلکٹر کے دفتر کے سامنے کھڑی

تھی۔سوتی ساڑھی میں ملبوس، بکھرے بالوں کا جوڑا باندھے۔ویران آنکھیں اور سونی مانگ لئے۔اُسے پنچایت کے صدر کے خلاف شکایت کرنی تھی۔وہ اُس کے ماتحت سے بحث کر رہی تھی۔اور وہ اُسے جھڑک رہا تھا۔ڈی۔سی۔سوریہ ونشی کی کار رکی۔کار کے شیشے میں ایک شبیہ اُبھری۔

''کیا یہ وہی ہے'' یہ میری آنکھوں کا دھوکہ تو نہیں!

کیا یہی پھالگنی ہے! کیا یہ میری پھالگنی ہے۔اُس کے کئی رنگین عکس مختلف زاویوں سے ذہن میں اُبھرے۔

''گاڑی آفس کے پچھلے دروازے کی طرف لو! اس کی بھرّائی آواز اُبھری۔

وہ بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا۔دھم سے کرسی پر گرا۔اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔یہ پھالگنی تو نہیں ہوسکتی۔وہ ریشم و کمخواب پہننے والی پھالگنی اس طرح! اُسے کسی طرح یقین نہیں آرہا تھا۔

اُس نے بیل بجائی۔ملازم نمودار ہوا۔

اے۔سی۔شندے کو بھیجو۔'' اُس نے اپنی آواز پر مشکل سے قابو پاتے ہوئے کہا۔

''یس سر'' شندے سامنے کھڑا تھا۔

''باہر کھڑی عورت کون ہے کیا چاہتی ہے''۔

''صاحب وہ پھالگنی کلکرنی ہے۔کبھی اس کا باپ دیسنور کا زمیندار ہوا کرتا تھا۔وہاں کی پنچایت کے صدر نے ساری زمین خرید لی ہے۔دو ایکڑ زمین رہ گئی ہے اُس پر بھی وہ قبضہ مار چکا ہے۔یہ ہے کہ دینے کو تیار نہیں۔اچھے خاصے پیسے بھی دے رہا ہے۔'' وہ کاروباری زبان بول رہا تھا۔گویا قصور پھالگنی کا تھا۔

''کیوں دے اس کی زمین ہے۔کسی کے باپ کا راج ہے!'' وہ چیخ رہا تھا۔

''صاحب آپ! آپ کیوں غصہ ہو رہے ہیں''! شندے حیرت میں تھا۔اتنے ٹھنڈے مزاج کے صاحب آج اچانک غصّہ سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''تم ایک کام کرو۔فون کر کے اُس پنچایت صدر کو بلالو'' اُس نے حکم دیا۔

''جی صاحب'' ایک نمک خوار کی نمک حلالی خطرے میں پڑ رہی تھی۔اُس عورت پر شندے کو بڑی زور سے غصہ آیا۔اچھی خاصی سیٹنگ تھی۔جانے یہ کہاں سے منہ اٹھائے چلی آئی۔دو کوڑی کی عورت۔وہ بڑبڑاتا باہر نکل گیا۔

وہی صبح تھی وہی انتظار۔وہی مندروہی ندی کا پاٹ۔

مگر وقت بدل گیا تھا۔

کردار وہی تھے۔حالات بدل گئے تھے علی الصبح وہ بغیر ڈرائیور کے خود اپنی کار چلاتے ہوئے نکل چکا تھا۔دل بے قابو دھڑک رہا تھا۔صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اُسے بس دیکھنا مقصود تھا۔تیس سال کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس آرہا تھا۔وہ اپنے کھیتوں میں کام کررہی تھی۔دو لڑکیاں اُس کے ساتھ تھیں۔ایک شاید پندرہ کے آس پاس تھی۔ایک بارہ کے آس پاس بڑی لڑکی ہو بہو پھالگنی تھی جو ساتھ کھڑی تھی۔دوسری کا رنگ ذرا دب رہا تھا۔پہلی نظر میں وہ چکرا گیا۔کیا یہ پھالگنی ہے۔میری پھالگنی۔جانے اب جذبے کیسے ہیں۔کوئی اپنا مانے نہ مانے،کوئی بندھن ہو نہ ہو۔دل جسے اپنا لگے وہ بس اپنا ہی لگتا ہے۔بھلے کسی کی قید میں کیوں نہ ہو۔

مگر پھالگنی!اس کی دمکتی مانگ سونی کیوں تھی۔وہ ایسے کپڑوں میں کیوں تھی۔اُس کے ڈھیر سارے زیورات،اُس کے کپڑے۔اس کی بگھئی۔ڈھیرے سارے سوالات۔

کار رکی۔وہ بڑی بے تابی سے اترا۔کھیتوں میں دوڑ لگائی۔ایک لمحے کے لئے وہ بھول گیا کہ وہ ڈسٹرکٹ کلکٹر ڈی۔سی۔سوریہ ونشی ہے۔

وہ وہی سوریہ تھا۔کالا کلوٹا۔بس سلیقے کے سوٹ میں تھا اور اس کا عہدہ جھاڑو والے سے ڈی۔سی۔میں تبدیل ہو چکا تھا۔مگر کمبخت دل وہی تھا جذبے وہی تھے،کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

"پھالگنی"!وہ بڑی بے تابی سے پکارا۔

لمحے کے ہزارویں سکینڈ سے پہلے وہ پلٹی۔پورے حواس کان بن گئے۔کیا یہ وہی آواز ہے سالوں پہلے جو اُس نے صرف ایک مرتبہ سنی تھی۔

ہاں وہ وہی تھا۔کسرتی بدن،چوڑا سینہ،سلونی رنگت،سلیقے سے سنوارے بال،قیمتی سوٹ،اتنی لمبی سی گاڑی،بڑے سلیقے سے پروقار انداز میں چلتا وہ اس کی طرف آرہا تھا۔

کمر میں اُڑسی ساڑھی کے پلو کو اُس نے سلیقے سے سر پر اوڑھا اور ہاتھ میکانکی انداز میں جُڑ گئے۔

"نمستے صاحب"۔گاڑی کا بورڈ اُس نے پڑھ لیا تھا۔

"آپ یہاں؟ڈی۔سی۔صاحب!"لہجہ اجنبی ہو گیا۔وہ اس کی پہچان ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"میں سوریہ ہوں پھالگنی!"وہ دانت چبا کر دھیرے سے بولا،اُس کے اجنبی لہجے پر اُسے جھلاہٹ

ہو رہی تھی۔

”ہو صاحب مجھے معلوم ہے! آپ سوریہ ونشی ہو!“

یہ دونوں میری بیٹیاں صاحب! ان کا باپ مر گیا ہے۔ یہ تھوڑی سی زمین رہ گئی ہے جو ہمارا آخری سہارا ہے۔ پنچایت کا ادھیکش اسے بھی ہتھیانا چاہتا ہے! میں اسی کی شکایت لے کر آپ کے دفتر گئی تھی صاحب“۔ وہ آپ کا افسر میری نہیں مان رہا۔ آپ کیوں آ گئے؟ صاحب میں خود آج آنے والی تھی“ وہ بڑے انکساری و بڑی تفصیل سے بولی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، دھول اُڑاتی گاڑیاں اور لوگوں کی ایک بھیڑ اکھٹا ہو چکی تھی۔ شاید گاؤں میں ڈی سی کی آمد سے ہنگامہ مچ گیا تھا۔ پنچایت صدر ہانپتا ہانپتا قریب آیا۔

”صاحب میں آج آنے ہی والا تھا آپ نے کیوں کشٹ کیا۔“

”حکم دیں صاحب!“ وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

”میں نے سنا تم اس کی زمین ہڑپ رہے ہو! شرم نہیں آتی؟ بے بس عورتوں پر ظلم کرتے ہو!“

”صاحب میں قیمت دینے کو تیار ہوں!“

”کاہے کی قیمت! اس کی زمین کی قیمت تم دو گے؟ تم! دو کوڑی کے آدمی! جانتے بھی ہو یہ کون ہے۔؟“ اس کی آواز میں غصّے کی شدت تھی۔

”ہو! صاحب یہ تیس سال پہلے زمیندار کی بیٹی تھی۔ اب تو یہ اکیلی ہے صاحب میں اسے پیسے دینے کو تیار ہوں! یہ راجی ہی نہیں ہوتی!“

”وہ نہیں بیچنا چاہتی تو تمہاری زبردستی ہے! خبردار اس سے دور رہو! ورنہ منہ کی کھاؤ گے!“

”جی جو حکم صاحب“! پنچایت صدر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”تم لوگ چلو سب میں آفس آتا ہوں دیکھیں تم نے پنچایت میں کیا راج مچا رکھا ہے“۔ وہ غرایا۔

”جی صاحب“۔ سب پیچھے ہٹ گئے۔

”اور تم پھالگنی کلکرنی کل میرے دفتر آجانا“ اُس نے تاکید میں اُنگلی اُٹھائی اور بھاری قدم اُٹھاتا چل دیا۔

”تم نے مجھ سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ وہ مجسم سوال تھا۔

”جی صاحب مجھے نہیں پتہ تھا۔ آپ کہاں ہو“ وہ دبے لہجے میں بول رہی تھی۔

’’وشنو کو کیا ہوا تھا‘‘ شراب اُسے پی گئی صاحب۔ خون تھوکتا مر گیا۔ شراب میں ساری زمین بھی بیچ دی۔‘‘

’’اور بابا؟‘‘ اس کا سوال باقی تھا۔

’’بابا الیکشن ہار گئے۔ الیکشن میں زمینیں بک گئیں اور بابا ہار سنبھال نہیں سکے۔ زمین سے زیادہ اُن کو اپنی ہار کا بہت دکھ تھا۔ پھر وہ بھی چلے گئے۔ پیچھے اماں بھی سدھار گئیں۔ جب تک بابا تھے سب دبے رہتے تھے، پھر ایک ایک چیز بک گئی اور اب یہ زمین بھی!‘‘ اس کی آواز بھر آ گئی۔

’’زمین کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم بیٹھتی کیوں نہیں! کب تک کھڑی رہو گی؟‘‘ وہ جھلایا آج بھی اُس کے سامنے وہ خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔

’’نہیں صاحب رہنے دو۔ گاؤں میں لڑکیاں اکیلی ہیں مجھے جانا ہے‘‘

’’میں نے ابھی تک شادی نہیں کی! تم چاہو تو!‘‘ وہ آگے بول نہ سکا۔ ’’نہیں صاحب۔ ہمارے جذبے سچّے تھے۔ خواب کچّے تھے۔ حقیقت بن نہ سکے۔ کل میرا رتبہ بڑا تھا۔ آج آپ کا رتبہ بڑا ہے۔ یہ دیوار نہ آپ توڑ سکتے ہیں نہ میں!‘‘

اُس کے لہجے میں ٹھہراؤ اور سختی تھی۔ ’’آج کے بعد آپ مجھے کبھی نہیں دیکھیں گے۔ اپنی زندگی میں آگے بڑھ جائیں ماضی میں لوٹنے کی کوشش نہ کریں‘‘ وہ بڑے تاکیدی اور حتمی انداز میں بولی۔

وہ تیزی سے مُڑی متانت سے چلتی ہوئی۔ اُس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ اُس کے پیچھے بند دروازے کو تکتا رہ گیا۔

وہ جو اُس کی زندگی کی بہار تھی جا چکی تھی۔ ساری بہاریں ہمیشہ کے لئے اُسے سونپ کر۔

مرکزی خیال: کنڑی ادیب جناب موہن ناگمنور

جھوٹا سچ

آج آفس آتے آتے مجھے بڑی دیر ہوگئی، چھوٹی بیٹی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔اسے یرقان ہوگیا تھا آٹھ دس دن اسپتال میں رکھنے کے بعد کل گھر لے کر آئی۔آج صبح اس کا پرہیزی کھانا اور گھر میں دیگر لوگوں کا کھانا بنا کر آفس نکلتے دیر ہوگئی۔میں نے سڑک اسپیڈ پر اپنی اسکوٹر بھگائی تب کہیں جا کر صحیح وقت پر پنچ (بایئو میٹرک) کر سکی۔یہ سسٹم بھی عجیب ہے پڑھے لکھے لوگوں سے انگوٹھا لگواتا ہے کہ اپنی شناخت دو۔

آج آفس کا ماحول بڑا خوش کن تھا۔مجھے ماحول کی تبدیلی بہت خوشگوار لگی۔دس دن دواخانے میں رہ کر میں خود کو بڑی بیمار محسوس کر رہی تھی۔

جیسے ہی میں سٹاف روم میں داخل ہوئی عاشر کی چیخ نما نعرے نے میرا استقبال کیا۔

''ویلکم آپی آج سعید سر کی پارٹی ہے۔''

''کیا؟ پارٹی اور وہ بھی سعید سر کی۔'' میں اپنی حیرت چھپا نہیں سکی۔سعید سر کی پارٹی لینے کا مطلب واقعی معاملہ بہت بڑی خوشی کا تھا ورنہ وہ بے کار بات بات پر پارٹی دینے والوں میں سے نہیں تھے۔

''کس خوشی میں پارٹی دی جا رہی ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''حمید سر کی بیٹی کا انڈین ایئر فورس میں کو پائلٹ سلیکشن ہوا ہے'' عاشر کی خوشی دیکھنے لایق تھی کیوں کہ ایک لحاظ سے عاشر سعید سر کا داماد تھا۔ان کے بڑے بھائی کی بیٹی عاشر کی بیوی تھی۔

''سر کہاں ہیں؟ چلو مبارکباد دے آتے ہیں۔''

سر کو تلاش کرتے ہوئے ہم پرنسپل کے چیمبر میں داخل ہوئے۔سر پرنسپل ستیش نندن کو ساری رام کہانی سنا رہے تھے۔

''کانگریچولیشن سر! بہت بہت مبارکباد'' ہمارہ نعرہ بلند ہوا۔

''شکریہ بھئی تم سب کا'' سر کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔

سعید سر کی دو بیٹیاں تھی۔ان کو بیٹا نہ ہونے کا کبھی افسوس نہیں تھا۔انھوں نے اپنی بیٹیوں کو ہمیشہ بیٹا ہی سمجھا اور بالکل اسی انداز میں پرورش کی حتیٰ کہ کبھی لباس بھی لڑکیوں والے نہیں پہنائے۔ان کی بڑی لڑکی نے جو میری ہم عمر تھی ایم ایس سی ایگری سائنس (زرعی سائنس) کرنے کے بعد کے۔اے۔یس۔

(کرناٹک ایڈمنسٹریٹیو سروس) پاس کیا اور کرناٹک ملک فیڈریشن کے ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھی ۔وہیں کے جے ڈی سے اس نے شادی کرلی جو اتفاق سے مسلمان بھی تھا۔سر بہت نازاں تھے۔اب یہ دوسری خوشی ان کے دامن میں آئی تھی،ان کی دوسری بیٹی بنگلور کے ہندوستان ایروناٹک ادارے سے ایروناٹک انجینئرنگ کررہی تھی اور آخری سال میں کیمپس سلیکشن میں وہ انڈین ایئر فورس میں منتخب کرلی گئی تھی۔چھوٹے شہر سے اپنی قوم کی لڑکی کا انتخاب عام بات تو نہ تھی۔سعید سر کا دیرینہ خواب،فلسفہ اور ایمان مکمل ہوگیا تھا۔انکا فلسفہ اور ماننا تھا کہ لڑکے لڑکی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔یہ ہمارا اپنا سماج،مائنڈ سیٹ اور سماجی نفسیات ہے جس کو بدلنا بہت ضروری ہے جس کی وجہ سے ہم لڑکے اور لڑکی میں فرق کرتے ہیں۔مگر اپنی انتھک محنت سے انھوں نے اپنے فلسفے کو یقین اور دیرینہ خوآب کو سچ کر دکھایا تھا۔

میں ذرا فرسودہ اور آوٹ ڈیٹیڈ خیالات کی ہوں۔میں بھی پڑھی لکھی ہوں مگر میرا مائنڈ سیٹ بڑا فرسودہ ہے حالانکہ اسسٹنٹ پروفیسر لگی ہوئی ہوں،انگریزی ادب پڑھاتی ہوں مگر اب بھی برقعے میں ہی رہتی ہوں اور صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب کالج سے باہر آتی ہوں تو نقاب لگا لیتی ہوں اور فرسودہ روایتی برقعے والی بن جاتی ہوں۔

میری اور سعید سر کی ہمیشہ نظریاتی ٹکر رہی،حالانکہ میں نے اسی کالج سے گریجویشن کیا ہے اور ان کی بہت عزیز شاگرد بھی رہی ہوں۔تب بھی میں برقع،میں رہا کرتی اور ان کے طنز اور طعنوں کا شکار رہتی۔آج میں ان کی ماتحت اور اسسٹنٹ پروفیسر ہوں،آج بھی وہ میرے برقع پر طنز کرنے سے نہیں چوکتے۔

میں لڑکیوں کی تعلیم اور خود مختار و خود کفیل ہونے کے خلاف کبھی نہیں رہی،مگر مغربی تہذیب کی اندھادھند تقلید اور حد سے زیادہ فیشن زدگی کے خلاف ضرور رہی ہوں جس کی وجہ سے ہمیشہ کالج میں مذاق کا نشانہ بنی رہتی ہوں،نشانہ بنانے والوں میں سعید سر ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔

میں خود دو بیٹیوں کی ماں ہوں اور میری بڑی بیٹی میڈیکل میں پڑھتی ہے مگر میں نے ہمیشہ اپنی بچیوں پر حجاب لازم رکھا۔میری بڑی بیٹی سفید ایپرن میں سر پر سفید اسکارف لگائے مجھے ہمیشہ باوقار اینجل دکھائی دیتی ہے۔میری دونوں بیٹیوں کے درمیان تیرہ سال کا فرق ہے۔میری دوسری بیٹی پیدائشی بصارت سے محروم پیدا ہوئی تھی۔جس کی آنکھوں کی بینائی کے لئے مجھے دو سرجریز (جراحی) کروانی پڑیں۔جس کے لئے مجھے اپنا رہائشی مکان بھی بیچنا پڑا۔وہ اسکول نہیں جا پائی مگر میں نے گھر پر ہی اس کی

تعلیم کا انتظام کر رکھا ہے۔اب وہ کچھ انگریزی پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہوگئی ہے۔مگر اس کی سمعی یادداشت اور سماعت بڑی تیز ہے اور وہ چھ زبانیں بولتی اور سمجھتی ہے کیونکہ میں خود چھ زبانیں جانتی ہوں۔

آج سر کی کامیابیاں اور خوشیاں دیکھ کر پہلی بار میرا ایمان ڈگمگایا تھا اور مجھے لگا کہ میں نے اپنے فرسودہ خیالات اپنی بچیوں پر لاد کر شاید ان پر ظلم کیا تھا۔میری طرح وہ بھی حبس زدہ زندگی گزارتی ہیں۔زندگی کی تمام رعنائیوں، ہاؤ ہو اور رنگ و بو سے محروم۔اگر میں بھی بیٹیوں کو آزاد رکھتی تو وہ بھی اپنی زندگی بھرپور انداز میں جیتیں۔مگر میں کیا کروں میں ایسا نہیں کرسکتی کیونکہ میں طلاق یافتہ ہوں۔میری طلاق کی وجہ بھی میرا فرسودہ پن برقع، پرانے خیالات اور بیٹیوں کی پیدایش ہی رہی ہے۔میرا سابقہ شوہر فوجی تھا۔شراب کا دلدادہ۔فیشن زدہ زندگی کا عادی شخص، مگر بیٹیوں کے معاملات میں خود بڑا فرسودہ تھا۔پہلی بیٹی کی پیدایش پر ہی وہ ناراض تھا۔جب تیرہ سال کے وقفے کے بعد جب ایک اور بچی پیدا ہوئی اور وہ بھی بصارت سے محروم تو اس نے مجھے طلاق دینے میں تاخیر نہیں کی اور دوسری شادی کرلی۔

میں نفسیاتی طور پر بہت خوفزدہ عورت ہوں۔ایک تو مرد کے سائبان سے محروم، نوکر پیشہ گاڑی چلانے والی اور دو بیٹیوں کی ماں۔اگر تھوڑا بھی فری ہوجاؤں تو مجھ پر اور میری بیٹیوں پر آوارگی کا الزام لگانے میں ہمارا سماج دیری نہیں کرے گا اور میں بدکردار عورت کہلاؤں گی جو مجھے قطعی منظور نہیں ہے۔ میں اپنے سماج کی خصوصی مہربانیوں سے پناہ چاہتی تھی، اسی لئے فرسودہ بنے رہنا میری مجبوری بھی تھی اور عافیت بھی مگر اندر سے ایک اطمینان بھی مجھے تھا کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں صحیح کر رہی ہوں۔

مگر اس لمحہ میرا ایمان ضرور ڈگمگایا تھا۔سعید سر کو دیکھ کر بڑا رشک آیا کہ ایک طرف ایک باپ کی روشن خیالی نے تین عورتوں کو مطمئن زندگی دی اور ایک ناہنجار باپ نے بیٹیوں کی پیدایش کی وجہ ہم تین عورتوں کی زندگی کو جہنم بنا دیا تھا۔مجھے وہ سارے لمحے یاد آئے اور میں اندرون دکھ کے گھونٹ پی کر رہ گئی کیوں کہ میں اپنی کمزوری کسی پر بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔نہ کسی قسم کی سبکی اٹھانا مگر یہ سچ تھا اس دن سعید سر کی پارٹی کی خوشیوں والی شیرینی مجھے بڑی تلخ لگی تھی۔لیکن اک مصنوعی مسکراہٹ کا نقاب چڑھائے میں سارے پروگراموں میں بے دلی سے شریک رہی۔

دو سال بعد سر کا ریٹائرمنٹ تھا۔ایک دن اچانک سر نے کہا کہ کل ان کی بیٹی کی شادی کا ریسپشن ہے حالانکہ پچھلے دو سال سے ان کی بیٹی دلی میں رہایش پذیر تھی۔

میں نے ان کے چیمبر میں جا کر پوچھ ہی لیا ''سر آپ نے شادی کی دعوت تو دی نہیں اب سیدھے ریسپشن وہ بھی لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے کچھ کنفیوژن تو ہے۔''

''ارے تمہیں نہیں معلوم میں نے ہمیشہ روایتوں کے خلاف بغاوت کی ہے اور ماڈرن آدمی ہوں سو ہم نے دلی میں ہی سیدھی سادی کورٹ میرج کروادی بنا کسی دان دہیج کے۔اس کا ساتھی پائلٹ ہی ہے انڈین ایئر فورس میں۔شادی میں صرف ہم ہی شریک تھے اب سوچا سنگی ساتھیوں کے لئے یہاں ریسپشن میں رکھ لوں''۔حسب معمول ان کا لہجہ جاندار اور قہقہہ بہت بلند تھا۔''ہاں سر آپ بڑے خوش قسمت ہیں، بنا دان دہیج خرچ کئے آپ کو بہترین داماد ملے اور آپ کے بیٹوں کی کمی پوری کر دی۔بہت مبارکباد سر۔''

میں پھر مردہ دلی اور بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

میری بیٹی ان دنوں میڈیکل کے آخری سال میں تھی اور مجھے خود بہت اچھے رشتے کی تلاش تھی مگر پانچ رشتے جو ڈاکٹروں کے تھے بہت مہنگے تھے۔کسی کی ڈیمانڈ دس لاکھ کی کار تھی تو کسی کی چالیس لاکھ کے پیمنٹ ایم ڈی سیٹ کی تھی۔اگر میں اتنی باحیثیت ہوتی تو میں خود کار میں گھومتی اور اپنی بیٹی کا ایم ڈی سیٹ خرید لیتی۔اس لئے میں نے سارے پرپوزلس کو منع کر دیا۔کچھ تو ہمارا کرایہ کا مکان اور سادہ رہن سہن دیکھ کر ہی لوٹ گئے۔مجھے داماد بھی دیکھا بھالا مخلص شخص چاہئے تھا، جو ہم تین تنہا عورتوں کا صحیح معنوں میں محرم ثابت ہوتا۔انہی دنوں میرے بڑے بھانجے کا عندیہ آیا کہ وہ میری بچی کے لئے رشتہ دینا چاہتا ہے۔میری بیٹی کی خواہش تھی کہ اس کا شریک حیات ڈاکٹر ہی ہو جب کہ میرا بھانجا انجینئر تھا اور خلیج ممالک میں رہائش پزیر تھا۔مگر میری مجبوریوں اور گھر کے حالات دیکھ اس بیچاری نے ہاں کر دی۔

سعید سر کی بیٹی کے ریسپشن کے دن کسی نہ کسی طرح یہ بھید کھل ہی گیا کہ لڑکا برہمن ہے اور دلی میں شادی بھی برہمنی طریقے سے ہوئی تھی پھر سیول میرج ہوئی۔اب سر اپنی کٹی ناک بچانے کے لئے لڑکی کو شرارہ سوٹ اور داماد کو شیروانی پہنا کر وداع کر رہے تھے، جبکہ پورا سسرال برہمنی لباس میں نظر آرہا تھا اور ریسپشن کا پورا کھانا ویجیٹیرین تھا۔سر بڑے خوش تھے کہ ان کے بہت روشن خیال اور سچے سیکولر ہونے کی بڑی تعریفیں ہو رہی تھیں اور مجھ جیسے فرسودہ اور پرانے خیالات رکھنے والوں کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔آج سر نے دوغلے سیکولر سماج والوں کو پکا ثبوت دے دیا تھا کہ وہ کتنے روشن خیال اور سچے ہندوستانی ہیں۔میوزک کا شور، ڈانس، شراب اور ہاؤ ہنگامے کے بیچ دُلہن وداع ہوئی۔

میں نے اپنی بیٹی کی شادی بہت سادگی کے ساتھ اپنے بھانجے سے کردی۔ ایک مہینہ کی دوڑ دھوپ کے بعد میری بیٹی کا حیدرآباد کے ایک مسلم میڈیکل ادارے میں ایم ڈی کا داخلہ کروا کر میرا داماد پر دیس سدھار گیا۔

اب گھر میں، مَیں اور میری کمزور بصارتوں والی بچی ہی رہتے ہیں۔ ان دنوں زندگی بڑی مضمحل، سوگوار، اداس اور بیزار کن رہتی۔ سر کے ریٹائرمنٹ کے بعد مجھ پر اایچ او ڈی کی ذمہ داری بھی آ گئی، آفس کا کام بڑھ گیا تھا اور بچی بھی بلوغت کو پہنچ چکی تھی، اسے گھر میں تنہا چھوڑنا بھی میرے لئے مسئلہ بن گیا تھا۔ میں نے گاؤں سے اپنی اماں کو بلوایا کہ بچی کے ساتھ گھر پر رہ سکیں مگر اماں ہر ماہ دو چار دن آبائی وطن ضرور جاتیں تاکہ ہمارے گھر کی صاف صفائی کروا سکیں اور وہ تین چار دن مجھ پر بہت بھاری ہوتے۔ گھر پر اکیلی بچی اور میرا سارا دھیان بچی کی طرف لگا رہتا۔ نتیجتاً میں کالج میں چڑچڑی ہو جاتی۔ طلباء میرے قریب آنے سے کتراتے کہ میڈم آج غصے میں ہیں۔ اماں واپس آجاتیں تو میں پھر سے پرسکون ہو جاتی۔

اپنا گھر فروخت کرنے اور طلاق کے بعد میری ساری توجہ لڑکیوں پر رہی کہ کسی طرح ان کی اچھی پرورش ہو اور تعلیم و تربیت ہو جس کی وجہ سے ہم کرائے کے مکان میں ہی رہتے تھے۔

بڑی بیٹی جب ایم ڈی کے دوسرے سال میں تھی تب داماد نے اصرار کیا کہ میں اپنا گھر خریدلوں جس کے دو پورشن ہوں، ایک میں وہ اور میری بیٹی رہ سکیں اور دوسرے پورشن میں ہم دونوں رہ سکیں۔ وہ ہر چار ماہ میں ایک مرتبہ ہندوستان کا چکر ضرور لگاتا۔

ان دنوں کافی دوڑ دھوپ اور تلاش کے بعد میں نے مطلوبہ مکان ڈھونڈ ہی لیا، میری ساری جمع پونجی کے باوجود مجھے بنک سے قرض لینا پڑا۔ میری دوڑ دھوپ کا رخ دوسری سمت مڑ گیا۔ سارے کاغذات اور دستاویزات کی تیاری کے بعد اللہ اللہ کر کے بنک نے سبز جھنڈی دکھائی اور کہا کہ ایڈریس ویری فکیشن اور دی گئی معلومات کی جانچ کے لئے ہمارے گھر آئیں گے۔ یہ ان دنوں کا وقفہ تھا جب اماں آبائی گاؤں گئی ہوئی تھیں۔ ناچار مجھے چھٹی لینا پڑی اور میں گھر میں رہ گئی۔ ان دنوں بھاگ دوڑ نے میرا بی پی بھی بڑھا دیا تھا۔ چھٹی کے دو دن گھر کی صاف صفائی میں گزر گئے۔

یہ ہم نوکر پیشہ عورتوں کی مجبوری ہے کہ چھٹیوں میں ہی ہم گھر کو صاف ستھرا اور رہنے کے قابل بناتے ہیں۔ بنک سے کوئی نہیں آیا۔

تیسرا دن جمعہ تھا۔میں نے سوچا جمعہ ہے،نہا دھو کر ذرا سورۂ کہف ہی پڑھ لوں ورنہ سارے جمعے تو آفس میں گزرتے ہیں اور بس نام کی نمازیں آفس کے چیمبر میں ادا ہوتی ہیں۔

میری تلاوت کو فون کی رنگ نے بہت شدت سے ڈسٹرب کیا اور مجھے شدید چڑ ہوئی۔

فون پر عاشر کی بڑی گھبرائی ہوئی سی آواز تھی

''کیوں کیا ہوا،اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''میں نے سوال کیا۔

''آپی سعید سر کی وائف کا انتقال ہوگیا ہے آپ جلدی آجائیں''۔

''کیا؟ ارے اب بتارہے ہو؟ کب ہوا؟ کیونکر؟ کیسے؟''میں نے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

''آپی سنیں مجھے معلوم ہے آپ کی طبیعت خراب ہے،میں آپ کو نہیں بتانا چاہتا تھا مگر یہاں معاملہ نازک ہے،بس آپ جلدی آجائیں۔جس طرح بھی ہو جلدی آجائیں بس''۔

''ارے ہوا کیا ہے بتاؤ تو سہی کیوں الجھا رہے ہو؟''میں نے جھلا کر کہا۔

''بس آپی میں بتا نہیں سکتا۔آپ فوراً آجائیں،وقت کم ہے۔''اتنا کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔میں عجیب مخمصے میں تھی،جاؤں تو بچی اکیلی اور اگر بنک والے آگئے تو۔اور میت کا معاملہ نہ جاؤں تو بھی تف تھی مجھ پر!

میں اکثر غسال کی خدمت بھی ادا کرتی ہوں،میں نے سوچا وقت نماز قریب ہے شاید کوئی غسالہ نہ ملی ہو اس لئے مجھے یاد کیا ہو۔یہ سوچ کر میں نے درمیانی ہال کی کھڑکی سے اپنی مکان مالکن کو پکارا''روشن آپا ہمارے پہچان والوں میں موت ہوگئی ہے،مجھے بلایا جارہا ہے آج شاید بنک والے آجائیں،اگر کوئی آئے تو آپ ذرا بچی کے پاس آکر بیٹھ جائیں ورنہ یہ اکیلی گھبرا جائے گی''۔روشن آپا بڑی مشفق خاتون تھیں اور ہماری مصیبت کے وقتوں کا سہارا بھی۔جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا بیشک اللہ ہوتا ہے جو انسانوں کی شکل میں مدد کے فرشتے بھیج دیتا ہے،روشن آپا ہمارے حق میں فرشتہ ہی تھیں۔

میں نے اپنی سکوٹی نکالی اور جتنی تیزی سے بھگا سکتی تھی بھگا لے گئی۔

مگر وہاں کا منظر عجیب تھا،جنازہ تو تیار تھا مگر،سارے سفید کپڑوں اور ٹوپیوں میں ملبوس لوگ گھر سے سو میٹر کی دوری پر کھڑے تھے،سر کا کہیں پتہ نہیں تھا۔عاشر اور سعید سر کا بڑا داماد بس گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔گیٹ کے اندر عورتوں کا ہجوم تھا۔

جیسے ہی میں نے گاڑی روکی عاشر تیر کی طرح میرے پاس آیا۔

''آپی اچھا کیا آپ آ گئیں۔ سر کا سیکولرزم اور بیٹیوں کو بیٹا بنانے کا فلسفہ کھا گیا۔'' وہ بہت تنفر اور غصے میں بول رہا تھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''اندر ان کی دونوں بیٹیاں بضد ہیں کہ وہ جنازے کو کندھا دے کر قبرستان لے جائیں گی کیونکہ وہ ان کی بیٹیاں نہیں بلکہ بیٹے ہیں۔ دونوں اب بھی پینٹ شرٹ میں اور برہنہ سر ہیں۔ جنازہ لے جانے والے ملحقہ مسجد کی جماعت کے افراد باہر چلے گئے ہیں کہ عورتیں اس لباس میں جنازہ اٹھائیں گی تو وہ جنازہ نہیں اٹھائیں گے اور نہ نماز جنازہ پڑھنے مسجد تک لے جائیں گے۔ جنازے کو نماز جمعہ سے پہلے مسجد لے جانا ہے آپ پلیز کچھ کریں انھیں سمجھائیں۔'' وہ بڑی تیزی سے بول رہا تھا اور میں ہکا بکا کھڑی سن رہی تھی۔

''میں کیا کروں؟ سر کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں سمجھاتے اپنی بیٹیوں کو؟'' میں چڑ گئی تھی۔

''وہ دیکھیں وہاں جو بیٹھے ہیں سر گارڈن میں، وہ خود سمجھا سمجھا کر تھک گئے ہیں۔'' میں نے پہلی مرتبہ سر کو پینٹ شرٹ میں سر جھکائے ٹوپی پہنے شکست خوردہ انداز میں دیکھا۔ سچ ہے موت ہر انسان کا غرور توڑ دیتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ وہی سعید سر ہیں جو ہمیشہ سوٹ اور ٹائی میں کلین شیو اور شاد ماں شاد ماں، بات بات پر قہقہہ لگانے، ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔

میں ساری صورت حال سمجھ گئی اور اللہ کا نام لے کر اندر داخل ہوئی، پہلے ان کی بڑی بیٹی شگفتہ کو الگ لے گئی اور اس سے پوچھا ''کیا تم اپنی ماں کو سچ میں دفنانا چاہتی ہو کہ یہیں رکھوانا چاہتی ہو؟'' وہ میرے اس غیر متوقع سوال سے پریشان ہو گی۔

''دفنانا تو ہے'' وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔ اسے ٹوٹتا دیکھ کر میں نے بات آگے بڑھائی۔

''تو چلو پھر لباس بدلو اور کوئی شلوار سوٹ پہن لو اور سر پر دوپٹہ ڈال لو۔'' وہ میری بات سن کر کچھ دیر کو ٹھٹکی، میں نے عاشر کی بیوی کو اشارہ کیا کہ وہ اسے اندر لے جا کر اپنا شلوار سوٹ پہنا دے۔

پھر میں دوسری کی جانب بڑھی جس کا نام تو شیرین تھا مگر اپنے نام کے بالکل برعکس تھی، اسے قائل کرنے تک میرے پسینے نکل گئے۔

وہ کسی بھی طرح لباس بدلنے پر تیار نہ ہوئی، میں نے اندر سے عاشر کی بیوی کا ایک اور دوپٹہ منگوایا اور زبردستی اس کے سر پر لپیٹا اور سینہ ڈھانک دیا، جس کے لئے وہ بہ مشکل راضی ہوئی، پھر میں نے عاشر، ان کے بڑے بھائی کے داماد اور عباس یعنی سر کے بڑے داماد سے درخواست کی، کہ وہ جنازے کو

سامنے کی طرف کے بازوؤں سے پکڑیں اور یہ دونوں پیچھے کی طرف پکڑ کر گیٹ تک لے جائیں گی۔ وہاں سے جماعت کے لوگ آ کر جنازہ لے لیں گے اور یہ گیٹ سے باہر نہیں آئیں گی۔

سعید سر کی دونوں بیٹے نما بیٹیوں نے پیچھے سے جنازہ اٹھایا اور سامنے سے دونوں دامادوں نے۔ کلمۂ شہادت کی آواز سے فضا گونج اٹھی اور سر کی بیوی کا جنازہ مسجد کی جانب روانہ ہوگیا۔ اب یہ دونوں دھڑام سے زمین پر گر پڑیں اور رونے پیٹنے لگیں، جتنی گالیاں انھیں آتی تھیں سب کی سب مسجد، جماعت، سماج، فرسودہ روایات اور مجھے دے سکتی تھیں دیتی رہیں، کہ ہم نے ان کا بیٹا ہونے کا حق ان سے چھین لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کو اٹھایا، سینے سے لگایا اور پچکارتے ہوئے کسی طرح اندر لے گئی کہ ہم جتنا بھی بیٹا بن جائیں لیکن دفنانے اور جنازہ لے جانے کے وقت بیٹیاں ہی رہیں گی، بیٹا نہیں۔

ہم سب عورتوں نے مل کر ظہر کی نماز ادا کی اور جب میں نے دعا مانگنی شروع کی تو سب کی سسکیاں نکل گئیں، رقت کا ماحول طاری ہوگیا۔ میں واپسی کے لئے جب باہر نکلی تو سر کی بڑی بیٹی شگفتہ آ کر میرے گلے لگ کر رو پڑی ”کاش ڈیڈی نے ہم کو دین سکھایا ہوتا یا پھر بیٹی ہی بنا کر بڑا کیا ہوتا“۔

میں نے کس کر اسے گلے لگایا۔ ہلکے سے اس کی پیٹھ تھپ تھپا کر نکل گئی۔

میں بڑی عجلت میں گھر پہنچی تھی۔ روشن آپا میری بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ کوئی آیا ضرور تھا۔ میں نے گھبراہٹ میں پوچھا ”کیا ہوا؟“

”ارے منہ میٹھا کرواؤ! تمہاری یہ ان پڑھ تو سو پڑھے لکھوں سے تیز نکلی۔ بنک والے آئے تھے۔ شاید انھوں نے پچاس سے زیادہ کنڑی اور انگریزی میں سوال کئے ہوں گے۔ تیری بیٹی نے برابر سے پورے جواب دئیے، انھوں نے سارے فارم بھر لئے، مجھ سے تصدیق لی اور جب دستخط کا معاملہ آیا تو میں انگوٹھا لگانا چاہتی تھی، مگر تیری اس بیٹی نے تیرے پروفیسر ہونے اور تیری بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اس نے انگریزی میں دستخط بھی کر دئیے، وہ بھی ایک جگہ نہیں دس جگہوں پر“۔

روشن آپا تفصیل سے بتا رہی تھیں اور ان کی ستارہ آنکھیں تابندہ تھیں۔

میں نے بے یقینی سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ”تو نے دستخط کئے؟ کیا لکھا تو نے؟“

وہ خاموشی سے اندر گئی اور کاغذ قلم لے کر لوٹی اور بڑی خستہ تحریر میں لکھا Saima Khan۔

”ایسے!!“

اس نے کاغذ میری طرف بڑھایا، میرے لئے وہ کاغذ بنک کے بیس لاکھ کے چیک سے زیادہ قیمتی تھا۔

میں بچی کو گلے لگا کر بے ساختہ رو پڑی۔ میری دونوں بیٹیوں پر آج مجھے بہت بہت فخر محسوس ہوا اور افسوس نہ رہا کہ میں نے ان کو فرسودہ انداز میں بڑا کیا تھا۔ میں مسلسل رو رہی تھی اور روشن آپا مجھے گلے لگا کر میری پیٹھ تھپک رہی تھیں۔ کئی دنوں سے گلے ملنے کی نعمت سے محروم میں، اور بلکتی رہی۔

دوسرے دن صبح میں نے دروازہ کھولا تاکہ اخبار لے سکوں۔

پہلے صفحہ پر لگی خبر نے مجھے چکرا دیا

''مسلمان ترقی کی راہ پر۔ مسلمانوں میں مثبت تبدیلی۔''

آزاد نگر کے پوش علاقے میں خُصوصی اکثریت پڑھے لکھے مسلمانوں کی ہے یہاں آج ایک خوش آیند تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ شہر کے مشہور وظیفہ یاب پروفیسر کی بیوی کے انتقال پر ان کی دونوں بیٹیوں نے ماں کے جنازے کو بیٹا بن کر کندھا دیا۔ یہ ایک مثبت تبدیلی ہے خُصوصی طور پر اس لئے کہ مسلمان اپنی فرسودہ روایتوں سے باہر نکل رہے ہیں جس کی یہ عمدہ مثال ہے''۔

نیچے جنازے کی تصویر میں واضح طور پر ان کی بیٹیوں کے ساتھ برقع میں میری تصویر بھی تھی جو میں ان دونوں کو پیچھے کھینچنے کے لئے ان کے ساتھ گیٹ تک آ گئی تھی۔ اخبار لے کر میں پلٹی تو قد آدم آئینے میں مجھے خود اپنا آپ دھندلا نظر آیا۔ میرا عکس دھندلاتے دھندلاتے معدوم ہوتا گیا۔ سب کہتے ہیں آئینہ سچ بولتا ہے مگر میرا، آئینہ تو جھوٹ بول رہا تھا۔ اور یہ سچ تھا۔

بلّی

گاؤں کی سب سے عمر رسیدہ اور تجربہ کار بڑھیا جو گاؤں کے زمین دار کی ماں بھی تھی، گھر کے آنگن میں پھیلے پاپڑوں کی نگہبانی ایسے کر رہی تھی جیسے وہ گھر کے تمام امور اور لوگوں کی نگہبانی کرتی تھی۔ سوکھے پاپڑ الٹ پلٹ کرتی اور کڑک پاپڑوں کو ساڑھی کے پلو میں سمیٹ کر اندر لے آتی اور چار پائی پر پھیلا دیتی۔

پانچویں پھیرے پر اس نے دیکھا گلی کے نکڑ سے اس کا پوتر داماد نمودار ہو رہا تھا جس کی پیٹھ پر بڑی سی گٹھری تھی۔ گٹھری کے پیچھے گٹھری بنی اس کی پوتی بغل میں چھوٹی گٹھری دبائے مضمحل انداز میں چلتی دکھائی دی۔

شدّو! پانی لے آؤ، دیکھو تمہاری آپی اور بھائی جان آ رہے ہیں۔

شدو کے ساتھ اس کی پوری ٹولی دوڑی اور پانی کی بالٹی رکھ دی گئی تا کہ وہ لوگ ہاتھ پاؤں دھو کر اندر آ جائیں۔

دوپہر کا کھانا اور چائے کے ساتھ رحیمو نے دادی کے پیر چھو کر آشیرواد لیا اور اجازت چاہی۔

’’ارے داماد جی اس کا باپ آنے تک تو رک جاتے۔‘‘

’’نہیں دادی بارش کی آمد ہے، کھیتوں میں بویائی چل رہی ہے، اماں نے رات سے پہلے لوٹنے کو کہا ہے، چلتا ہوں‘‘ کہتا ہوا وہ یہ جا وہ جا ہو گیا۔

’’ذرا اچھا سا سالن اور روٹیاں نرم بنائیو، میری بچی بڑے دنوں بعد گھر آئی ہے، سسرال میں کیا کھاتی ہو گی اتاّ سا منہ نکل آیا ہے‘‘۔ دادی نے بہوؤں کو آواز دی اور پھر پاپڑ سمیٹنے آنگن میں چل دی۔

رات کے کھانے کے بعد دادی نے اپنے کمرے میں پوتی کا بستر لگوایا اور دلار سے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

’’سب ٹھیک تو ہے سسرال میں۔ اتنا بڑا گٹھر دے کر بھیج دیا سسرال والوں نے۔ بہت دن کے لئے چھٹی دے دی ہے کیا؟‘‘ دادی متجسس تھی۔

’’لمبی چھٹی نہ دیں تو اور کیا کریں دادی۔ کھالی گود اور بنجر زمین کو کون گھر رکھے!‘‘ ہمارے بیاہ کو تین سال ہونے کو آئے ہیں ابھی تک ہم بچہ کیا مرا چوہا بھی نہیں دے سکے ان لوگوں کو۔‘‘

’’ارے بچے کیا پیڑ پہ اگتے ہیں جو توڑ کر دے دیں۔ دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ یہ تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے کسی کی جلدی، کسی کی دیر میں گودی ہریاتی ہے! اپنے ہاتھ میں تھوڑی نا ہے کہ بچہ پیدا کرلیں۔ ہٹی کٹی تو ہے، تجھے کیا ہوا ہے۔؟ جو بچہ نا ہوگا۔؟ آج نہیں تو کل ہو جاوے گا جلدی کا ہے پڑی ہے ان لوگوں کو۔؟ بے صبرے لوگ مالک کی مرجی نہ چاہیں گے؟ اپنی ہی کریں گے۔‘‘

’’جلدی کاہے کی دادی اماں! تین سال تو راستہ دیکھا ان لوگوں نے اب اور کتنا دیکھیں گے۔ ہماری قسمت ہی پھوٹی ہے کسی کا کیا دوش۔!! ہماری ساسو تو دوسرے بیاہ کی بات کرے ہے رحیمو کی‘‘۔ کہتے کہتے منی کی آواز رُندھی ہوگئی۔

’’کیا کہا دوسرا بیاہ کروائے گی؟ کیا سمجھ رکھا ہے جمین دار کی بیٹی بیاہ کر لے گئے ہیں، معمولی گھسیارے کی نہیں۔‘‘ دادی کی آواز میں جاگیردارانہ نخوت عیاں تھی۔

مگر کہن سال تجربہ کار تھی کسی کو ہوا لگنے نہیں دی، کوشش کرتی کہ پوتی کا دل بہلا رہے اور کاموں میں مشغول رہے۔ منی کو کبھی کبھی چھوٹ بھی دی جاتی کہ وہ سکھی سہیلیوں کے ساتھ گھومے پھرے اور تھوڑی بہت مستیاں کرلے، مگر جوبن کے دن، وہ بھی بیاہی جس نے جوگ پہلی بار دیکھا ہو، وہ کس کھیل سے بہل سکتی تھی؟ رات ہوتے ہوتے جسم کی بے چینی چہرے سے عیاں ہوتی اور پھول سا چہرہ مرجھا جاتا۔ کبھی کبھی نظریں دالان میں پڑی بان کی چار پائی پر لیٹی دروازے سے نظر آتے راستے پر ٹکی ہوتیں۔ دادی کی جہاں دیدہ نظروں سے کچھ چھپا نہیں تھا۔

رات سوتے ہوئے دادی نے پوچھا ’’تمہارے اور رحیمو کے سمبندھ کیسے تھے۔ تجھ سے پیار تو کرتا تھا؟‘‘

’’ہاں دادی پیار تو بہت کرے ہے پر ماں سے ڈرتا بھی بہت ہے‘‘، منی نے معصومیت سے جواب دیا۔

’’ارے بدھو میں یہ پوچھ رہی ہوں تمہارے ساتھ سوتا بھی تھا کہ نہیں، کچھ اس سمبندھ کے بارے پوچھوں ہوں‘‘ دادی نے اس کے سر پر ہلکا سا ٹہوکا دیا۔

منّی نے شرما کر دادی کے سینے میں منہ چھپالیا۔

’’دادی ہفتہ پندرہ دن میں ایک بار ہو تو ہو ورنہ رحیمو تو اکثر منہ پھیر کر گودڑی اوڑھے سو جاتا ہے۔ میں گودڑی کھینچوں تو کہتا ہے تھکا ہوا ہوں سارا دن کھیت میں کام کرتے تھک جاتا ہوں۔ تمہیں ہر وقت یہی

سوجھتا ہے کیا!''

''تم میں لڑائی نہیں ہوتی؟''

دادی پر آگہی کے نئے در کھل رہے تھے۔

''ہاں دادی لڑائی کس کے گھر نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے، روٹھ بھی جاتی ہوں تو منا لیتا ہے یا پھر میں ہی بھول جاتی ہوں کہ ناراض تھی، کھیتوں سے تھکا ہارا آتا ہے بیچارہ، مزدور نہ ملیں تو مزدوری بھی کرتا ہے، مجھے ہی ترس آجاتا ہے اس پر''۔ دادی کا سینہ اپنی پوتی کی سمجھداری پر چوڑا ہوا اور خود کی تربیت کو من ہی من سراہتے ہوئے بولی''میری سمجھدار منی اتنی اچھی تو ہے تو۔ ان کو کاہے صبر نہیں ہے اولاد تو ہوگی دیر سویر۔ اچھا چل اب فکر نہ کر سو جا۔ مولا سائیں سب ٹھیک ہی کرے گا۔''

ساون کی رم جھم بدن کی آگ بڑھاتی رہی۔ منی سوچتے سوچتے خوابوں کی وادی میں اتر گئی۔

''ارے بہو یہ چوہوں نے کیا اودھم مچا رکھی ہے، تم سے ہجار بار کہا ہے کہ بلی ہی پال لو۔ زہر ملا کھانا لگاؤں تب بھی تم ہلہ مچا دیتی ہو۔ کل رات چوہوں کی آوازوں نے سونے ہی نہیں دیا۔ دالوں کے سارے تھیلے کتر رکھے ہیں بکھری دالیں سمیٹ تو لو۔''

''اماں آپ زہر مت رکھیو۔ چوہے مر کر گودام میں کہیں بھی پڑ جائیں تو گھر بھر بدبو پھیل جاتی ہے۔ ڈھونڈ کر صفائی کرتے کرتے تھک ہی جاتے ہیں۔ ہاں بلی پالنے کا سوچا جا سکتا ہے مگر اس کی گندگی کون سمیٹے اور وہ ہر تین مہینے میں بچے جنے گی سو الگ۔'' بہو بلیوں سے نالاں نظر آرہی تھی۔

''ارے شدّو کھیل سے فرصت ملے تو پچھلی گلی کے شانو کو بلا کر لے آنا کچھ دن اس کی بلّی ہی رکھ لیتے۔ ہر لمحہ بلّی لئے گھومتا رہتا ہے۔''

شاہنواز صاحب کا تعارف یہ تھا کہ گاؤں کے وہ اکلوتے پڑھے لکھے سجّن تھے، جو میٹرک پاس کرنے کے بعد شہر گئے تھے۔ مگر سات سال شہر میں آوارہ گردی کے بعد بھی کالج پاس نہیں کر پائے۔ گاؤں کے سب گھروں کے جو بھی کام ہوتے ان کو لے کر روزانہ شہر ضرور جاتے، شام میں لوٹ آتے کام کروا کر اور اپنے محنتانہ کے طور پر سو دو سو لے لیتے جس سے ان کا خرچ چل جاتا۔ ماں باپ ان کے کالج پاس ہونے کی آس لئے ملک عدم سدھار چکے تھے۔ اب یہ اکلوتے آبائی گھر میں گاؤں کے مسیحا بنے ہر ایک کے بلانے پر بے دھڑک چلے آتے اور گاؤں کے ہر گھر میں ان کی کچھ نہ کچھ شناسائی ضرور تھی۔ جب

گھر میں ہوتے تو ایک بڑے بڑے بالوں والی سفید بلّی ان کی گود میں چڑھی رہتی یا یہ چوپال میں باتیں کر رہے ہوتے اور ان کی بلّی چوک کی دکان پر بھجیا کھانے چلی جاتی۔

دادی کا بلاوا آتے ہی شاہنواز بھائی بلّی کے ساتھ ہی حاضر ہو گئے۔

''کیا بات ہے دادی کیسے یاد کیا'' وہ دادی کے قدم چھو کر پوچھ رہے تھے۔

پھر ان کی نظر بھری بھری جوبن لدی منی پر پڑی۔''ارے منی تم کب آئیں۔اچھی تو ہو سسرال والے کیسے ہیں؟؟''

''ٹھیک ہی ہوں شانو بھائی! سسرال میں بھی سب ٹھیک ہی ہیں۔''منی اپنا پلو جماتے خود کو سمیٹتے ہوئے بولی۔شانو کی گہری اترتی نظریں اسے بے چین کر رہی تھیں اور دادی کی نظریں کچھ پڑھ رہی تھیں۔

''ارے بیٹا مہینے پندرہ دن کے لئے اپنی بلی کو ہمارے گھر چھوڑ دو ہمارے گھر میں چوہوں نے اودھم مچا رکھی ہے''۔

''ارے دادی یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے! یہ رکھ لیجے بلّی۔میں سمجھا تھا شہر میں کوئی کام ہے اور آپ نے یاد کیا ہے۔''شانو کی آواز میں مایوسی در آئی،انھیں آمدنی کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آرہا تھا۔

''منّی جا یئو تو بلّی کے لئے ذرا ملائی دار دودھ ہی لے آیئو کہ یہاں یہ ذرا رچ بس جائے۔''

منّی جھٹ سے دودھ لے آئی اور اسے رکھنے کے لئے نیچے جھکی تو اس کے کھلے گریبان سے جوبن کی بجلیاں سیدھے شانو پر گریں اور ان کے اندر ہل چل سی مچ گئی۔

بلّی کو دودھ پیتا دیکھ شانو اٹھا اور دادی سے جھک کر آشیرواد لیتا ہوا بولا''دادی اب بلی آپ کی میں ذرا دوسرے کام دیکھ لوں۔''

بلّی نے ملائی دار دودھ پی لیا، کچھ تیل والے پکوڑے بھی چکھے، پھر گھر آنگن کی ڈیوڑھی کود کر یہ جا وہ جا۔

دوسرے دن شدو بلّی کو پھر لے آیا۔دودھ اور تلے پاپڑ بھی رکھے گئے۔بلّی چٹ کر گئی، پھر ڈیوڑھی کود گئی۔

تیسرے دن دادی کا پیغام آیا کہ شانو کو بلّی لے کر خود آنا ہے اور ایک گھنٹہ بیٹھنا ہے۔

شانو بلی لے کر آیا بلی کو گودام میں چھوڑ کر کڑی لگائی اور خود، دادی سے باتیں کرتا بیٹھ گیا۔اس کی متلاشی نظریں ادھر ادھر ہونے لگیں تو دادی نے آواز دی منی! ارے او منی!! ذرا چائے اور پکوڑے تو تل لیجیو۔شانو اور اس کی بلی آ گئے ہیں۔

''تھوڑی دیر بعد جھلملاتی جوبن کی بجلیاں گراتی منی چائے اور پکوڑے لے کر آ گئی اور سارے گاؤں کی خبریں شانو کے منہ سے سنتی رہی۔ درمیان میں کبھی وہ کھلکھلا کر ہنستی تو شانو کے کانوں میں جلترنگ بجتے اور دادی کی معنی خیز نظریں شانو کی والہانہ نظروں کو تاکتیں۔

ایک دن اچانک منی کا باپ دوپہر کھیتوں سے جلدی آ گیا اور شانو کو گھر پر بے تکلف دیکھ کر ٹھٹکا ضرور۔ اس کی گھورتی نظروں سے پریشان ہو کر منی اندر چلی گئی اور شانو جلدی اُٹھ گیا۔

''یہ کیا ہے اماں۔ یہ کیوں گھر میں گھس رہا ہے اور منی کی سسرال والے کب آئیں گے اسے لے جانے، کچھ زیادہ دن ہی نہیں ہوئے منی کو یہاں آئے ہوئے، ان کو بلا بھیجیں۔''

گو کہ جاگیر دار گھر کے معاملات میں ماں کی حکومت مانتا تھا مگر اس طرح باہر کے مرد کا گھر میں بے تکلف آنا اسے پسند بھی نہیں تھا۔

پھر اس رات دیر تک ماں بیٹے کے درمیان گفتگو رہی جس کے بعد وہ سر ہلاتا ماں کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن کہیں سے چچا کو خبر ملی کہ رحیمو کی ماں لڑکیاں تلاش رہی ہے۔ اور وہ آپے سے باہر ہو کر بندوق لے کر ماں کے سامنے آیا ''اماں آشیرباد دو میں اس رحیمو اور اس کے باپ کو ختم کر آؤں۔''

''اوئے پگلے بندوق نیچے رکھ، بڑا آیا دامادکو مارنے والا۔ تجھے پولیس لے جائے گی تو تیری بیوی اور بچوں کو کون دیکھے گا۔ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو'' بڑھیا گرج رہی تھی۔ چچا تاؤ کھاتا پیر پٹختا اندر چلا گیا۔

شانو اور اس کی بلّی کے آنے پر کسی اور کے آواز اٹھانے کی ہمت نہیں رہی۔

بارش کی دوپہر سارے مرد کھیتوں میں مشغول و مصروف تھے۔ عورتوں کو راحت تھی۔ بارش نے موسم ٹھنڈا کر دیا تھا، عورتیں اپنے اپنے کمروں میں کمر سیدھی کر رہی تھیں۔ دادی حسب معمول دالان میں پان لئے سپاری کوٹتی بیٹھی تھی۔ آج شانو بلی چھوڑ کر جا چکا تھا اور منی بھی شاید کسی کمرے میں گھسی سو رہی تھی۔ دادی رفع حاجت کے لئے پچھواڑے گئی تو اس نے دیکھا کہ گھاس کی بنبی کے پیچھے منیّ کی ساری کا پلّو پھیلا جھانک رہا تھا۔ اس نے کنکھار کر تھوکا اور بیت الخلا میں داخل ہو گئی۔ واپس نکلی تو پلوّ غائب تھا۔ ہاتھ پیر دھو کر دادی اندر آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد شانو ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور پیر چھوئے۔

''سدا سکھی رہو''! دادی کی آواز گمبھیر تھی۔

''منی شانو کے لئے چائے تو بنانا ذرا اور میرے لئے بھی لے آنا۔''

چائے لاتی منّی کے ہاتھوں اور پیروں میں کپکپاہٹ واضح تھی۔

''ارے میری بچی آؤ تم بھی بیٹھ جاؤ'' دادی کی آواز میں دنیا جہاں کا پیار سمٹ آیا تھا۔

منی اور شانو نے ایک دوسرے کو دیکھا، دونوں کی آنکھوں میں اطمینان تھا جو اس سے بے خبر تھا کہ دادی کی نظریں انھیں تاڑ رہی ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد دادی نے بڑی بہو کو آواز دی۔

''بہو آج میرا اور منی کا بستر چھت پر برساتی میں لگانا۔ بارش نے حبس بڑھا دیا ہے نیند ہی نہیں آتی کمبخت ماری ان بند کمروں میں۔''

''جانے اُنہیں اس برسات میں برساتی میں سونے کا کیا شوق ہے'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی بہو اوپر سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دی۔

ڈیوڑھی کا دروازہ خود بند کرتے ہوئے دادی چھت پر پہنچ کر منی کے ساتھ لیٹ گئی۔ آدھی رات میں منی کی نیند کھلی، کوئی قریب تھا اور اس کی مونچھیں اسے چبھ رہی تھیں۔

''تم''! وہ کسمسائی، پلٹ کر دادی کو دیکھا جس کے خراٹے بلند ہو رہے تھے۔ دونوں سائے گودام میں کھسک گئے۔

بارش کا زور تھما۔ دھوپ کی آنکھ مچولی اور کبھی کبھی نظر آتی قوس قزح میں منی کا نکھرتا رنگ گھر والوں کی نظر سے چھپا نہیں رہ سکا۔

دادی کا ایلچی منی کے سسرال پہنچا۔ رحیمو کا بلاوا تھا کہ جاگیر دار کے گھر والے کسی درگاہ پر چڑھاوا دینے جا رہے تھے، داماد کے بنا کیسے جاتے۔ رحیمو ماں کی اجازت سے سسرال پہنچا اور چڑھاوے کی رات درگاہ سے ملوث کمروں میں منی کے ساتھ رہا۔ دادی کا حکم اور منت تھی کہ یہاں کی مانگی دعا ہمیشہ سنی جاتی ہے۔ درویش بابا چاہیں گے تو اس سال منی کی گود بھی ہری ہو جائے گی۔ دو دن دو راتیں گزار کر سارا کنبہ گاؤں لوٹ آیا۔ فصل کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ کسانوں کے کام بھی بڑھ گئے تھے۔ دادی نے منت مانی تھی کہ منی کے لڑکا ہوا تو درویش شاہ ہی نام رکھیں گی۔ بلّی چوہے پکڑتی رہی۔ شانو کبھی آتا کبھی نہ آتا۔

تیسرے مہینے منی کی سسرال میں ایلچی خبر لے کر آیا۔

منی کا تیسرا مہینہ چڑھا ہے۔ بابا نے دعا سن لی۔ رحیمو کی اماں نے بابا کے نام کے چراغاں کئے اور سارے گاؤں میں مٹھائی تقسیم کی۔

ساتواں مہینہ گود بھرائی کی رسم کے لئے سسرال جا کر منی واپس لوٹی۔ اس کی رنگت کھلی کھلی ہوئی تھی، سارا نکھار اس پر اتر آیا تھا۔ بھرپور عورت سب کی نگاہوں کو بھا رہی تھی ماں باپ اور دادی بلائیں لیتے نہ تھکتے۔ ہر پندرہ دن رحیمو خیر خبر لینے پہنچ جاتا۔ سب بہت خوش تھے کسی کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔

دسمبر کی سرد دوپہر شانو معمول کی طرح جاگیر دار کے گھر آیا، دالان سونا تھا، دادی بھی کہیں نظر نہیں آئی، وہ اندر چلا آیا۔ منی کی اماں میٹھی اور ناریل کے لڈو بنا رہی تھی اور چچی شاید چولھے پر چائے ابال رہی تھی۔ ''چاچی! دادی اور منیّ کہاں ہیں؟''

وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا اور اس کی بلی بالائی والا دودھ ڈھونڈ رہی تھی۔ تبھی چچی نے زور کی لات بلی پر جھاڑی اور چیخی ''کمبخت ماری بلیّ دودھ جلدی نہ ڈالوں تو پیر ہی کاٹ لیتی ہے۔''

اس کی چیخ سن کر نہ جانے دادی کہاں سے نکلی۔ ''ارے شانو تم یہاں اندر پکوان گھر میں!!!! بیٹا بھرا پرا گھر ہے، عورتیں ہیں، اس طرح منہ اٹھائے اندر نہ چلے آیا کرو۔ کچھ تو لحاظ کرو گھر کے مرد آ گئے تو کیا کہیں گے؟''

''وہ دادی آپ کے چوہے پکڑوانے بلّی لایا تھا'' وہ ہکلایا۔ یہ نیا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

''بیٹا چوہے کافی کم ہو چکے اور تمہاری بلی کافی چوہے پکڑ چکی۔ ویسے بھی کسان کے گھر میں چوہے نہ رہیں تو اور کہاں رہیں؟ چوہے اور کسان کی تو ازلی دوستی اور چولی دامن کا ساتھ ہے کسان کے اناج میں ان کا بھی تو حصہ ہے تم اپنی بلی لے جا سکتے ہو۔''

بلّی دودھ پی چکی تھی۔

شانو نے جھک کر اپنی بلّی اٹھالی اور مڑے بنا باہر کی طرف چل دیا۔

مزکری خیال۔ جناب موہن ناگمنور، کنڑی ادیب

اردو قالب۔ مہر افروز

بے چہرہ

’’تم کون ہو....؟‘‘

’’میں مقدس خون کی امانت ہوں۔‘‘

’’کون سی امانت اٹھا رکھی ہے؟‘‘

’’قلم، خیر، ادب، نفاست، شیریں بیانی اور زبان کی۔‘‘

’’بہت بڑی امانت اٹھا رکھی ہے!! حق بھی ادا کر پاؤ گے؟‘‘

’’میں خیر اور زبان کی امانت اٹھانے کے لئے ہی بھیجا گیا ہوں۔‘‘

’’بہت خوب تم سے مل کر اچھا لگا، خوشی ہوئی۔‘‘

دو، وجود ایک ادبی کانفرنس میں ایک دوسرے سے مخاطب تھے۔ تین دن کی کانفرنس میں وہ بہت قریب آئے۔ ادب کے پھول کھلاتے کھلاتے خود سبزہ زار اور گلشن کی طرح پھیل گئے، محبت کی خوشبو سے معطر ہو گئے۔

’’تمہاری چھٹی کتنے دن کی ہے؟‘‘ وہ پریشانی سے پوچھ بیٹھی۔

’’بس ختم ہی سمجھو، میری کل کی سات بجے والی فلائٹ ہے؟‘‘

’’پھر ہم کب ملیں گے۔؟‘‘

’’ارے کیوں نہیں ملیں گے؟ ضرور ملیں گے۔ ہماری روحیں جو مل گئی ہیں، بدن تو ذریعہ ہیں تم میری روح میں بس چکی ہو!‘‘ دونوں بچھڑ گئے۔

’’روحِ مقدس! تمہارا وجود میرے اندر رہ گیا ہے۔ میرے اندر نور کی بارش اور سکون کے ڈیرے ہیں‘‘ وہ سرشاری میں بولی۔

’’بہت خوب تم نے مجھے مکمل کر دیا۔ میرے نورِ کے جز کو اٹھالیا، اور میرے مشن کی تکمیل میں شامل ہو گئی، میں تمہارا شکر گزار ہوں۔‘‘

’’مگر لوگ....وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔‘‘

’’کچھ نہیں ہوگا تم جدید دور کی عورت ہو اور ایک مقدس مشن کا حصہ ہو۔ بس اسے اٹھالو‘‘ اور اس نے

اٹھالیا۔ درد کے وقت، تخلیق کے وقت، وہ تنہا تھی اس کا کوئی اتا پتہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے مقدس مشن پر کسی اور جگہ تھا اپنا جز تقسیم کرنے۔

اس نے میسیج چھوڑا لڑکی ہوئی ہے اور تمہارے نور کی نسبت نورین کہلائے گی۔

وہ مقدس نور کی سرپرستی اور پرورش کرتی تنہا رہ گئی۔ تنہائیاں اسے رگیدتی کھینچتی، رگڑتی پتھریلی چٹانوں سے لاکر سمندر کے کنارے پھینک گئیں، کیونکہ وہ ایک لاش ہی تھی جس سے بدبو اور تعفن کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ پولس نے لاوارث سمجھ کر اس کا کریا کرم کر دیا۔ وہ ایک اور سرمئی شام تھی جب دو سائے پھر ساتھ تھے۔

''تم کون ہو۔۔۔؟''

''میں مقدس خون، ادب، پاسداری، زبان، نفاست، فراست، علم و عرفان کا حریم اور سفیر ہوں سات سمندر پار سے آیا ہوں۔''

''تم کون ہو۔؟ تمہارے وجود کی خوشبو کہیں میری روح میں بسی ہے۔ لگتا ہے تمہیں کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔''

''میں نورین ہوں۔ نورین تسمینہ''

''یہ کیسا نام ہے تم اپنے باپ کا نام استعمال نہیں کرتیں باپ نہیں ہے۔؟ تم ناجائز! حرا''

''ارے نہیں نہیں میں مقدس خون کی امانت اور مقدس روح کا نور ہوں۔''

''تسمینہ وہ ایک جسم کا نام تھا جس نے مجھے، یعنی مقدس نور کو اٹھایا، سنبھالا، پالا پوسا اور اس مقام پر کھڑا کیا کہ میں بھی ادب، نفاست، فراست اور عرفان کی سفیر بن سکی۔ اس نے مجھے بنایا کیونکہ وہ جسم تھی اور عمل پر یقین رکھتی تھی۔ اپنی زبان کو اور وعدے کو اس نے مجسم مجھے بنا کر پورا کیا اس لئے میں اس کا نام استعمال کرتی ہوں۔ مقدس خون اور روح نے تو مجھے اپنا نام بھی نہیں دیا۔ ناجائز اور حرامی کہلانے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔

سال خوردہ سایہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے لگا اس کا آئینہ اور وقت اس کے سامنے کھڑا تھا جس میں کوئی شکل نہیں تھی۔

سپنوں کے قاتل

انتساب بہ احترام جناب شموائل احمد، پٹنہ

''شاہد اور کتنا بھٹکیں گے، میں تھک رہی ہوں''۔

''تھوڑی دیر اور صبر کر لو، دو ایک گھر اور پھر واپس چلیں گے''۔

وہ دونوں میاں بیوی شہر میں گھر کی تلاش میں نکلے تھے۔ یہ شہر انھوں نے اپنی مرضی سے چنا تھا، قریے میں نوکری کرتے ان کے پانچ سال گزر چکے تھے۔ ان کی شادی کو بھی تین سال پورے ہو رہے تھے۔

شاہد کوٹ قلعہ دیہات کی اکلوتی پوسٹ آفس کا پوسٹ ماسٹر اور وہ قریہ کے اکلوتے سرکاری اسکول کی استانی تھی۔

روزانہ کا آنا جانا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانا ایک سال تک جاری رہا پھر انھوں نے اپنے والدین کی رضامندی سے شادی کر لی۔ دو سال میں قریہ کے پرسکون ماحول میں زندگی بہت خوبصورت ہو گئی تھی۔ قریہ کے قدرتی مناظر ہر قسم کے نفرت انگیز زہر سے پاک تھے۔ سماج کے تقریباً سب لوگ آپس میں مل جل کر رہتے حالانکہ یہاں بھی سبھی چھوٹی بڑی ذاتوں کے محلے الگ الگ ہی تھے، مگر انسانیت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

وہ دونوں اس قریہ کی زندگی اور ہر ذات کے لوگوں اور سماج کا اٹوٹ حصہ تھے۔ وہ شہر سے رابطے اور پوسٹ اور اخبار لانے کا واحد ذریعہ اور یہ قریہ کے ہر بچے کو انگریزی زبان پڑھانے والی اور علم بانٹنے والی پیاری سی معلمہ۔ سب لوگ دونوں سے بہت خوش تھے۔ یوں کہیں تو وہ پورے گاؤں کی چاہتوں کا مرکز تھے۔ اس لئے کہ سب لوگوں کی بنیادی ضرورتیں ان دونوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ جب انھوں نے وہاں سے نکلنے اور شہر جا کر بسنے کی بات کی تو سارا قریہ مخالفت پر اتر آیا، کوئی بھی ان دونوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

مگر شاہد بہت حساب کتاب والا بندہ اور منصوبہ ساز ذہن کا مالک تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فیملی شروع کرنے سے پہلے ان کا شہر منتقل ہونا بہت ضروری تھا تاکہ اپنے ہونے والے بچے کے لئے تمام سہولتیں

میسر ہوں۔اس لئے اس نے کوششیں شروع کر دیں۔

الگ الگ محکموں سے تبادلہ لینا۔وہ بھی ایک ہی شہر میں آسان نہ تھا،مگر شاہد جیسے زیرک شخص نے مشکل کام کو ممکن کر دکھایا اور ان دونوں کا تبادلہ قریبی شہر میں ہوگیا۔

اب رہائشی مکان کی تلاش شروع کر دی۔ایجنٹ کو کمیشن دی، ہر اتوار کو کوئی نہ کوئی اطلاع دیتا، یہ دونوں اپنی بائک پر شہر آتے کہ مکان دیکھ سکیں اور ہر بار یہی سننے کو ملتا۔

’’مسلمان کو گھر نہیں دیں گے۔‘‘

’’مسلمانوں کو گھر دینا منع ہے۔‘‘

’’گوشت کھانے والوں کو گھر نہیں دیا جاتا۔‘‘

’’سوری اس محلے میں مسلمانوں کو گھر دینا منع ہے،سوری ہم اس میں وشواس تو نہیں رکھتے مگر کیا کریں محلے والوں سے دشمنی تو نہیں لے سکتے‘‘ یہ سیکولر کہلانے والوں کا جواز ہوتا۔

برہمنی، مرہٹی، جینی، لنگایت، سب محلوں میں مسلمانوں کو گھر دینا منع تھا۔

وہ مسلمانوں کے محلے پہنچے، گندی تنگ گلیاں، ننگ دھڑنگ پھرتے گالیاں بکتے بچے، ایک دوسرے سے لڑتی عورتیں، بیڑیاں پھونکتے چوک پر بیٹھے بوڑھے، زردہ پان کھا کر پیک تھوکتے آنے جانے والوں پر فقرے کستے، تاکتے اور مذاق اڑاتے نوجوان۔

مرتا کیا نہ کرتا ایک دو گھر وہاں بھی دیکھے، ایک بیڈ روم کا گھر پانچ ہزار کرایہ اور ایک لاکھ ایڈوانس!

’’ایں یہ کیا ہے؟ ہم مسلمان ہی تو ہیں!‘‘ انھوں نے دلیل دی۔

’’مسلمان ہیں تو کیا ہوا، دونوں سرکاری ملازم بھی تو ہیں! اچھی خاصی تنخواہ ہوگی دونوں کی‘‘ دلیل کی جوابی دلیل بہت شاندار تھی، گویا سرکاری ملازم ہونا گناہ ہوگیا ہے۔وہ جہاں بھی گھر دیکھنے جاتے، لوگ ان کو اس طرح دیکھتے جیسے، ذبح سے پہلے قصائی جانور کو دیکھتا ہے کہ کتنا گوشت نکلے گا۔

ان دنوں عذرا کے دن چڑھ گئے تھے شام تک مکان کی تلاش میں مسلسل بھٹکنے تک وہ تھک جاتی اور شاہد پر چڑ جاتی۔

''تم سے کس نے کہا تھا کہ تبادلہ کروالو اور شہر آؤ یہیں پڑے رہتے سب تو کتنے اچھے ہیں۔''

''ارے کیا اس ماحول میں اپنا بچہ جنمے گا؟ مجھے اسے آئی اے یس بنانا ہے! آئی اے ایس! اس کے لئے شہر کا ماحول ضروری ہے تم نہیں سمجھوگی!'' شاہد کی اپنی منطق تھی۔ وہ جانے کن خوابوں کو دیکھ رہا تھا۔

''رہوگے کہاں؟ گھر تو نہیں دے رہا کوئی مسلمان کو''۔

''اطمینان رکھو مل جائے گا۔ بہت بڑا شہر ہے سب تعصب پرست نہیں ہیں۔ کہیں نہ کہیں کوئی انسان تو ضرور ہوگا''، کسی خوش آیند خواب سے اس کی سیاہ گہری آنکھیں ہمیشہ دمکتیں اور اس کے اس یقین کے سامنے وہ بے بس اور بے زبان ہو جاتی۔

آخرش ان کو مکان مل ہی گیا اور انھوں نے منتقلی کی ٹھان لی۔ ایک پوسٹ آفس میں کام کرنے والے دلت بھائی نے، جس کا تبادلہ دوسرے شہر ہو گیا تھا، اپنا مکان شاہد کو پانچ سال تک کے لئے کرایہ پر اٹھا دیا۔

جب وہ اپنا سارا سامان ٹرک میں بھر کر گاؤں سے نکلے، تو ان کو الوداع کہنے سارا گاؤں امڈ آیا، سب اسے ایسے وداع کر رہے تھے، جیسے ان کے گاؤں سے ان کی بیٹی جا رہی تھی۔ دونوں طرف آنکھیں نم تھیں۔ گاؤں سے باہر آ کر وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

دلت بھائی ویریندر چوان کے گھر میں انھوں نے اپنی زندگی کی پہلی رات گزاری۔ شاہد بہت خوش تھا اسے لگا، اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا معرکہ سر کر لیا۔ دونوں نے نئے جوش سے اپنا سنسار شروع کیا۔

شہر کے مشہور گاینا کالوجسٹ سریش کلکرنی سے انھوں نے رابطہ قائم کیا تا کہ بچہ محفوظ ہاتھوں میں پیدا ہو۔ ہر ہفتہ باقاعدہ چیک اپ کراتے۔ جیسے جیسے دن بھرتے گئے شاہد کے سپنے گہرے ہوتے گئے۔

آخری ہفتے کی اسکیننگ کے دوران ڈاکٹر نے کہا سرجری کرنا ہوگی، بچہ ابھی تک گھوما نہیں ہے، اب بھی سر اوپر اور پیر نیچے ہیں، دن بھر گئے ہیں، بچہ اور زیادہ دن تک رحم میں نہیں رکھ سکتے، پیدائش کا وقت قریب تھا۔

شاہد تذبذب میں تھا۔اس نئی افتاد نے اسے بوکھلا دیا۔وہ چاہتا تھا ڈلیوری نارمل ہو اور بچہ بھی نارمل ہو اس کے لئے اس نے سارے ڈاکٹری مشوروں پر عمل کیا تھا۔عذرا کا بہت خیال رکھا تھا۔ناں ناں کرتے بھی شاہد کو سرجری کے کاغذات پر دستخط کرنا پڑے۔عذرا آپریشن تھیٹر میں تھی اور وہ ہاتھ جوڑے پہلی جنوری کی سرد رات میں بے چینی سے باہر ٹہل رہا تھا۔

نرس بوکھلائی ہوئی باہر آئی۔

''لڑکی ہوئی ہے، پر رو نہیں رہی ہے''اس اطلاع پر شاہد بینچ پر بیٹھ گیا۔نرس شاید کسی اور طرف نکل گئی تھی۔

آکسیجن سلینڈر گھسیٹ کر آتی نرس کو دیکھ کر وہ اٹھا۔

''لڑکی ہی ہوئی ہے؟''اس نے تصدیق چاہی۔''ہاں ہاں لڑکی ہی ہوئی ہے''نرس دروازے کے پار غائب ہو گئی۔

شاہد کی مایوسیاں بڑھ گئیں،اس نے بادل ناخواستہ کوئن باکس والے فون میں سکّہ ڈالا اور نمبر لگائے۔

''اماں کو لے کر آجائیں۔عذرا کی سرجری ہوئی ہے،لڑکی ہوئی ہے''اس نے اپنے والد کو اطلاع دی۔

رات کے دو بجے ایک ننھی سی جان اس کے حوالے کی گئی،اس نے اسے گود میں لے کر ہلکے سے سینے سے لگایا،عجیب سی ہمک جاگی اور لگا یہ میرا ہی حصہ ہے،پھر وہ بھول گیا کہ لڑکی تھی۔

عذرا،اندر ہی تھی، کچھ پیچیدگیاں ہو گئی تھیں۔

صبح صبح بچی کو قے شروع ہو گئی،وہ ڈاکٹر کے پاس بھاگا۔

''ارے اسے تو فٹس آیا ہے۔''

''فٹس! کیوں؟ کیسے!؟''وہ مجسم سوال تھا۔

''کل جب یہ روئی نہیں تو ڈاکٹر نے اس کی گردن پر زور سے تھپکی دی تھی جو شاید کچھ زیادہ لگ گئی ہے''نرس بے خیالی میں بول گئی۔بچی کو انٹینسیو کیئر میں لئے جایا گیا۔اس کی ناک سے حلق میں نلی ڈالی جا رہی تھی فیڈنگ کے لئے۔وہ دیکھ نہیں سکا باہر نکل آیا۔

''اللہ یہ میرے ساتھ ہی کیوں؟''ہاتھوں میں چہرہ چھپائے وہ رو پڑا۔

شام کو ئی بری خبر منتظر تھی۔

''بچی کی قے میں خون آرہا ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟؟''

''حلق میں نلی ڈالتے وقت کہیں رپچر ہو گیا ہے، نرس کی غلطی ہے۔''

اب بولنے کی باری ڈاکٹر کی تھی جو نرس پر برس رہا تھا۔

وہ باہر سے دوسرے پیڈیاٹرک کو لے آیا۔

''اپنا خون چیک کروائیں، شاید بچی کو خون دینا پڑے'' بچوں کے ڈاکٹر سبھاش بھٹ نے کہا جسے وہ لے آیا تھا۔

عذرا کو پرائیویٹ وارڈ میں شفٹ کیا گیا۔

اس نے اپنا خون دیا دو دن کے اندر بچی کو ایک بوتل خون دیا گیا۔ بچی بہت سیریس تھی سانس چل رہی تھی۔

عذرا اپنے کمرے میں دعائیں مانگ رہی تھی، پہلا بچہ اور یہ کیسا امتحان ہے اللہ۔ وہ ساس کے گلے لگ کر رو پڑی۔

ستائس دن عذاب گزرے۔ بچی انٹینسیو کیئر میں، وہ تنہا کمرے میں، جنوری کی سرد راتیں بڑی سخت اور ظالم تھیں۔

اٹھائیسویں دن سوا لاکھ کا بل بھر کر وہ دونوں کو گھر لے آیا۔ گویا اس نے دو جانوں کی قیمت چکائی تھی۔

چھ مہینے گزر گئے، بچی صحت یاب ہو گئی، وہ دونوں بچی کو دیکھ کر جیتے۔

مگر عذرا نے ایک بات نوٹ کی۔ بچی کبھی اس کو دیکھ کر مسکراتی نہیں تھی، اسے دیکھتے ہی ماتھے پر بل ڈالتی اور زبان باہر نکالتی مگر جب اس کی آواز سنتی تو مسکراتی اور آوازیں نکالتی۔ جو بھی بچی کو دیکھتا یہی کہتا ارے اتنی سنجیدہ بچی یہ مسکراتی کیوں نہیں!

پھر وہ سبھاش بھٹ کے پاس گئے اپنا مسئلہ لے کر۔ ان کے لئے وہی خدا تھا جس نے بچی کو نیا جنم دیا تھا۔

اس نے پھر سے بچی کا معائنہ کیا اور کہا ’’مجھے لگتا ہے یہ دیکھ نہیں پاتی۔‘‘

’’کیا دیکھ نہیں پاتی؟ کیسے؟ کیوں؟‘‘ ان کے سروں پر دوسرا پہاڑ ٹوٹا تھا۔

’’ایک تو لڑکی اور وہ بھی دیکھ نہیں پاتی‘‘ شاہد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

’’آپ کے گھر میں کوئی اس طرح کا ہے؟‘‘ ڈاکٹر سبھاش بھٹ ان سے سوال کر رہا تھا۔

’’نہیں بالکل نہیں دس پشتوں میں بھی نہیں، نہ میرے نہ اس کے!‘‘ وہ چیخ پڑا۔

’’تحمل رکھیں، ہوتا ہے، کبھی کبھی کسی پچھلے جنم کا قرض چکانا پڑتا ہے‘‘ یہ ایک ڈاکٹر بول رہا تھا۔

’’ڈاکٹر صاحب میں جنموں میں یقین نہیں رکھتا، ایک ہی جنم کافی ہے سپنوں کا قرض چکانے کے لئے‘‘

وہ رو پڑا

’’یہ آنکھوں کے مشہور ڈاکٹر ہیں، ان کو میں نے یہ خط لکھ دیا ہے۔ کل کا اپائنٹمنٹ ہے، وہ معائنہ کر کے بتا دیں گے کہ وجہ کیا ہے اور کرنا کیا ہے آگے‘‘۔ آپ حوصلہ رکھیں وہ شاہد کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا۔

وہ بڑی امید لے کر دوسرے ناخدا کے پاس پہنچے کہ شاید وہ کوئی اچھی نوید دے۔

’’یہ تو یقینی ہے کہ یہ دیکھ نہیں سکتی، اس کی آپٹک نرو ڈیمیج ہے۔‘‘

Her optic nerve is damaged only eight centimeter remaining is good۔she has developed congenial cataract۔she has to be operated۔

’’اس کی بصارتی عصبیہ مجروح ہے جس کی وجہ سے خون دماغ سے آنکھوں تک نہیں پہنچتا اور بچوں کا موتیا بند ہو گیا ہے۔ عدسہ بھی مر گیا ہے آپریشن کرنا ہوگا‘‘ وہ تفصیل سے آنکھ خاکہ نکال کر سمجھا رہا تھا۔

’’کیا وجہ ہوئی، یہ کہیں سے گر گئی تھی کیا، اس کے چھوٹے دماغ پر چوٹ کا اثر ہے‘‘ اور شاہد کے دماغ میں پوری فلم گھوم گئی۔

’’کل جب یہ روئی نہیں تو ڈاکٹر نے اس کی گردن پر تھپکی دی تھی جو شاید زور سے لگی تھی۔‘‘ نرس کی آواز گونجی۔ وہ ہوش میں آیا۔ اس نے ڈاکٹر کو تفصیل بتائی۔

’’اوہ سن کر افسوس ہوا۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھی، ڈاکٹر انسان ہی ہیں بھگوان نہیں‘‘ کچھ نہیں کر سکتے آگے

کی سوچیں بس ایک ہی راستہ ہے آپریشن کروالیں ۔اس کے لئے آپ کو چنئی جانا پڑے گا۔"

"چنئی؟ کیوں؟"

"کیونکہ شاہد صاحب اتنے چھوٹے بچے کی آنکھوں کا آپریشن کرنا یہاں ممکن نہیں، اتنی سہولیات کا کوئی اسپتال قریب میں موجود نہیں ہے۔"

ایک اور نیا خط نئے بھگوان کا نام انھیں سجھا دیا گیا جو ان کی بچی کو بینائی دے سکتا تھا۔ بچی کی پیدائیش، عذرا کا مسلسل چھٹی پر رہنا، تنخواہ کا نہ ملنا، وہ کافی پریشان تھے، ان کی مالی حالت بہت خستہ ہوگئی تھی۔ اب یہ تیسری افتاد تھی۔

ان کو چنئی ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ جانا پڑا۔سارے ڈیپازٹ، لایف انشورنس فنڈز سے رقم نکالنا پڑی حتیٰ کہ وہ مقروض ہو گئے۔شاہد کے تمام تر سپنے خون آگیں تھے، کسی نے اس کے معصوم خوابوں کا خون کر دیا۔

ڈاکٹر گوپال کرشنن ان کو سمجھا رہا تھا۔

"دیکھیں آپریشن کے دوران بچی پوری طرح نابینا بھی ہوسکتی ہے یا ففٹی پرسینٹ دیکھ بھی سکتی ہے دونوں چانسز ہیں! ففٹی ففٹی، آپ اس پر دستخط کر دیں" ناخدا اپنی کمزوریوں کے جواز سے آگاہ کر رہا تھا۔

اللہ کا نام لے کر اس نے ساری ہمتیں سمیٹیں اور دستخط کر دیئے۔

جب اس کی آنکھوں کی پٹی کھلی تو وہ پہلی بار مسکرائی، اس کی مسکراہٹ ان کی زندگی کا سب سے بڑا انعام تھی "امی ابو" اس نے ان کو دیکھ کر پہلی مرتبہ پکارا۔ان دونوں کی بینائی دھندلا گئی۔وہ دونوں اس سے لپٹ کر رو پڑے۔

"یہ بینائی صرف ففٹی پرسینٹ ہے، دس فٹ سے زیادہ دور یہ کچھ نہیں دیکھ پائے گی۔ ہر وقت اس کو آپ کے سہارے کی ضرورت رہے گی، بہت زیادہ خیال رکھیں" وہ اپنی خوشیاں سمیٹے لوٹ آئے۔

بچی کے پانچویں سال ان کو اس کے اسکول کی فکر ہوئی، اس نے وہ سارے اسکول چھان ڈالے جہاں مخصوص بچوں کی تعلیم ہوتی ہو۔آفس میں کسی نے صلاح دی ایسے بچوں کے لئے شبھا کلکرنی کا اسکول بہت اچھا ہے۔

دونوں بڑی امیدیں لے کر وہاں پہنچے۔اسکول دیکھا، وہاں موجود بچوں کو دیکھا، سب سے بات کی، کچھ معصوم تو بول نہیں پاتے تھے کچھ سن نہیں پاتے، کچھ لنگڑے، لولے، آدھے اندھے، ادھورے معصوم سے پھول کھلکھلا رہے تھے، اس کی آنکھیں ان ادھورے کھلے پھولوں کو دیکھ کر بھر آئیں۔وہ دونوں اپنا غم بھول گئے۔مگر ایک بات عذرا کو کھٹکی تھی، سارے کے سارے بچے یا تو مسلمان تھے یا پھر عیسائی تھے یا دلت۔صرف دو بچے اونچی ذات کے تھے جو ذہنی معذور تھے۔

وہ دونوں پورا اسکول دیکھ کر آفس میں داخل ہوئے تاکہ بچی کا داخلہ کروالیں۔

گھومتی کرسی پر بہت خوبصورت پرنسپل سجی سنوری مسکراہٹ سجائے ان کا استقبال کررہی تھی، اس کی کرسی کے پیچھے ایک بڑی سی تصویر لگی تھی جس میں ڈاکٹر سبھاش کلکرنی، مشہور گاینا کالوجسٹ سفید شرٹ اور خاکی چڈی پہنے، کیسری جھنڈے کو سلامی دیتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔عذرا نے گھبرا کر پوچھا۔

''یہ یہ یہ کون ہیں؟''

''یہ میرے ہسبنڈ ہیں! سبھاش کلکرنی''۔شبھا کلکرنی کی مسکراہٹ گہرائی''ان کو مخصوص بچوں سے بہت محبت ہے اور اتفاق سے یہ سارے کے سارے انھیں کے اسپتال میں جنمے ہیں۔''وہ تفصیل سے بتا رہی تھی۔

وہ جھٹکے سے اٹھی بچی کو سینے سے لگایا اور تیزی سے باہر نکلتی ہوئی ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی باہر کو دوڑی جیسے اس نے کسی بچہ کھانے والے راکشس کو دیکھ لیا ہو۔

''شاہد باہر آؤ! باہر آؤ! میں یہاں اپنی بچی کو نہیں ڈالوں گی۔''

Be My Valentine

''مجھے تم سے محبت ہے، بے تحاشہ دیوانگی کی حد تک، میں جانتا ہوں ہم میں کوئی میل نہیں، تمہارے اور میرے ملک الگ، تہذیب الگ اور بہت زیادہ عمروں کا فرق ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں میں ایسی دیوانگی میں مبتلا ہوں۔ مجھ پر رحم کرو ایسی بے رخی مت برتو۔ بس یہ سرخ گلاب قبول کرو۔''

''یہ کیا دیوانگی ہے جاثم۔ تمہارا میرا کوئی میل نہیں، مجھ پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔ میں اپنے ہوش سے بیگانہ بھائی اور بوڑھی ماں کا اکلوتا سہارا ہوں۔ میں محبت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ میرے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ بس یہ ادب کا شوق ہے جو مجھے ادھر ادھر بھٹکاتا ہے۔

تم خود پر قابو رکھو، کل میں تمہیں بھول جاؤں گی! اپنے شہر لوٹ کر میری پھر وہی زندگی ہوگی۔''

''نہیں نہیں نہیں۔ محبت تمہارا مقدر ہے تمہیں جینے کا پورا حق ہے ایک دن اور رات سہی تم میرے اس گلاب کو قبول کرلو! اپنی سوچ بدلو اپنے خیال کو بدلو۔ تم بہت حسین ہو! خود کو میری نظر سے دیکھو، تم کتنی خوبصورت ہو! تمہاری بڑی بڑی غزال سی نشیلی آنکھیں، تمہارا یہ کسا بدن، تمہاری مدہوش کرتی آواز، تم جب شعر پڑھتی ہو تو سیدھے دل میں اترتے ہیں۔ تم مجھے پاگل کر چکی ہو! بس میری محبت کو قبول کرلو۔ آج کا دن میرے لئے بہت اہم ہے آج بس میری ویلینٹائن بن جاؤ۔''

''پاگل لڑکے تم اٹھو تو سہی۔ کب تک یونہی گھٹنے ٹیکے بیٹھے رہو گے۔ اٹھو تم کھڑے تو ہو جاؤ۔ یہ پاگل پن ہے محبت نہیں ہے یہ تمہاری عمر کا جوان جوش ہے اٹھ جاؤ۔''

''نہیں جب تک تم اس گلاب کو قبول نہیں کرو گی میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا، میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا تمہیں اپنا لوں گا، تم میری جان رہو گی ہمیشہ۔ تم جس دن دل میں نہ رہو گی وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ تم اسے شرف قبولیت دو۔ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ تم میرا دیوانہ پن اور انتہا ہو، تم میری ملکہ ہو، اس غلام کو قبول کرلو۔'' اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

اسے بے ساختہ رحم آیا ''یہ زندگی، یہ تنہائی اور یہ ایثار بھی کس کام کا؟ کیا برا ہے جو اس کی محبت کو قبول کرلوں۔ اتنا چاہنے والا بھی کب، کس کو، کہاں، ملتا ہے؟''

کچی پکی سوچوں کے بیچ وہ جھک گئی۔اس کے دونوں ہاتھوں اور گلاب کو تھام لیا۔دوسرے لمحے وہ اس کی سحر انگیز گرفت میں تھی اور بس ایک سرخ گلاب کے عوض پگھل گئی۔

آج ایک سال بیت گیا، وہ اس کی یاد بن گیا ہے۔پتہ نہیں کہاں ہے؟ چھ ماہ تک اس کے پیغامات آتے رہے پھر اچانک بند ہو گئے۔وہ پاگل ہو گئی۔دیوانوں کی طرح کال کرتی رہی مگر جواب ہمیشہ یہی آتا۔

The number you have Dialed dose not exist

جس نمبر پر، آپ نے ڈائل کیا ہے وہ ابھی بند ہے۔

کئی مرتبہ اس کا جی چاہا خودکشی کر لے، پھر بوڑھی ماں اور ہوش سے بیگانے بھائی کا خیال آتا اور اس کے قدم رک جاتے۔

آج کا دن اس پر بہت بھاری تھا۔بزم ریختہ کا پروگرام لائیو ٹی وی پر نظر آرہا تھا۔وہ دیکھتی رہی۔ اچانک کیمرے سامعین کی طرف مڑے۔اس کا ذہن بھک سے اڑ گیا۔وہ سامعین میں موجود تھا، کوئی اور لڑکی اس کی بغل میں بیٹھی تھی جسے وہ سرخ گلاب دے رہا تھا اور اس کی ہونٹوں کی جنبش کہہ رہی تھی۔

Will you be My Valentine today?

اس کی آنکھوں میں وہی نمی اور محبت تھی جس پر وہ لٹ گئی۔پتہ نہیں کب اس کا ہاتھ بے ساختہ اوپر اٹھا اور تڑاخ سے اس نے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔چھناک چھن چھنا چھن کرچیاں بکھر گئیں۔اس کا وجود، شیشے کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا۔بت کی مانند سن کھڑی وہ اس وقت ہوش میں آئی جب اس کی ماں چیخ رہی تھی۔

”پاگل لڑکی یہ کیا کیا تو نے؟ ٹی وی کیوں توڑ دیا؟“

ماں سے لپٹ کر وہ ٹوٹ گئی۔

”ٹی وی نہیں میرا وجود ٹوٹ گیا ہے ماں۔کل دوسری ٹی وی لے آؤں گی۔“

اور زندگی چل پڑی

ریل کی کم ہوتی رفتار اور ہچکولوں نے اسے سمجھایا کہ آخری پڑاؤ قریب تھا، اس کی منزل آچکی تھی۔ اسے اترنا تھا۔ جھک کر سیٹ کے نیچے سے اس نے اپنا صندوق نکالا۔ باہر sion لکھا ہوا دیکھ کر اترنے کے لئے سر پر صندوق اٹھائے چلنے لگا۔ ایک تو صندوق کی چوڑائی اور اس کے نوکیلے کونے لوگوں کو چبھ رہے تھے۔ اس کی اس قدامتی اڑچن سے لوگوں کی رفتار میں کمی آرہی تھی۔ سب کو باہر نکلنے اور جانے کی جلدی تھی۔ گالیاں کھاتا، بے درد لوگوں کے دھکے کھاتا، وہ اسٹیشن سے باہر دھکیلا گیا۔ سڑک پر آ کر اس نے اِنسانی جم غفیر کا سمندری سیلاب دیکھا، جو جانے کہاں آ، جا رہا تھا۔ گاؤں کے اس لڑکے کے لئے یہ منظر حیران کن تھا۔ اس نے اپنے گاؤں کے میلے، عید اور تہواروں کے دن بھی اتنے لوگ کبھی نہیں دیکھے تھے۔ باہر دور سڑک مڑنے کے بعد اسے ایک سرکاری پمپ نظر آیا، جہاں پر اس نے منہ ہاتھ دھوئے اور سامنے والی ہتھ گاڑی پر اس نے آدھی سے زیادہ ممبئی کے لوگوں کی روزانہ مرغوب غذا، وڑا پاؤ کھایا، آدھی کپ چائے پی کر خود کو تازہ دم کرلیا۔ صندوق سر پر اُٹھا کر وہ ملازمت کی تلاش میں چل پڑا۔ لوگوں کے اس سمندری شہر میں وہ ملازمت کی تلاش میں آیا تھا، تاکہ وہ اپنی دو بہنوں اور ماں کی ذمہ داری اٹھا سکے، جو اس کا باپ اس کے سر ڈال کر ملک عدم کو سدھار چکا تھا۔

دو دن گزر گئے، چپراسی سے لے کر دکان کے سیلز مین تک کی، آسامیوں کے لئے اس نے کوشش کی، مگر اس کالے بھجنگ مدراسی کو جو ہندی اور مرہٹی زبان سے نابلد تھا کوئی بھی رکھنے، تیار نہیں تھا۔ جیب میں موجود رقم کُھل رہی تھی۔ اب تک ملازمت ملنے کی نہ آس تھی نہ آثار۔ پیٹ کا دوزخ کہتا ملازمت کی آس چھوڑ دے، قلی حمالی ہی کر لے۔ مگر دماغ اندر سے کہتا کہ وہ تو مدراس ایگزامینیشن بورڈ کا سکینڈ ایئر پاس تھا، جس کی انگریزی بہت اچھی تھی، تو وہ قلی حمالی کیوں کرے۔ مگر یہاں اس کی انگریزی کی کس کو پڑی تھی! سب بمبیا زبان بولتے، جو اس کی سمجھ میں مشکل سے آتی۔

تیسرے دن کی شام تھک ہار کر اپنا صندوقچہ اتار کر ایسی جگہ بیٹھ گیا جہاں لوگوں کا بہاؤ شام کے وقت قدرے کم تھا۔ پیسوں کی تلاش میں اس نے اپنا لوہے کا بکسہ کھنگالنا شروع کر دیا۔ ایک ایک کر کے چار جوڑی کپڑے جھٹکے، پھر کتابیں جھاڑنی شروع ہی کیں تھیں کہ ایک کتاب سے دو روپیہ کا خستہ پھٹا نوٹ نکل کر گرا، پھٹا

نوٹ دیکھ کر اسے لگا کہ قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔نوٹ کو سنبھال کر اس نے اپنی شرٹ کے اوپری جیب میں رکھا،مزید پیسوں کی تلاش میں اس کی بھٹکتی نگاہ صندوق میں موجود ایک گئو ماتا کی تصویر پر پڑی اور ایک ہزار وولٹ کے بلب کی طرح اس کے دماغ میں ایک خیال کوندا۔اس نے تصویر اٹھالی۔کپڑے اور کتابیں سلیقے سے جمع کر تصویر ان کے اوپر رکھی اور سو گیا۔

علی الصبح جاگا،اسی پبلک نلکے پر اس نے اشنان کیا۔ادھر ادھر نگاہ دوڑائی،پاس میں چرتی کچھ آوارہ گئو ماتائیں دکھائی پڑیں،اس میں سے ایک اچھی خاکستری مائل گائے اس نے دیکھی،رسی کی تلاش میں نظر دوڑائی،پاس کے کسی گھر کی کمپاونڈ وال پر گیروا کا،پھرایا جھنڈا اور رسی دونوں نظر آئے۔گائے کو کھینچ کر وہاں تک لے آیا۔جھنڈا اور رسی کھول لی،رسی سے گئو ماتا کو باندھا اور گیروا کا جھنڈا اس کے سینگوں پر اٹکا دیا۔گائے کو اچھی طرح نلکے پر لا کر نہلایا اور اپنی صندوق کی جگہ بجلی کے کھمبے سے اسے باندھ دیا۔سڑک پر پڑے ایک پٹھے کو اٹھایا اس پر گئو ماتا کی تصویر چپکائی اور ہندی میں لکھا ''گئو ماتا کی رکشا کرو،گھاس کھلاؤ اور پُنیہ کماؤ'' اس بورڈ کو اس نے خوش کن ستائشی نگاہوں سے دیکھا اور کھمبے سے باندھ دیا۔پھر اس جگہ سے کافی ساری گھاس اکھاڑ لی اور اسے چھوٹے چھوٹے گچھوں میں باندھ دیا۔اپنے ادھ ننگے بدن پر وبھوتی کے تین تین پٹیاں ماتھے،کندھوں اور سینے پر بنائے،سیندور سے گئو ماتا کے ماتھے پر لمبا نشان بنایا اور گئو ماتا کو گھاس کھلاتے ہوئے آواز لگانا شروع کر دی۔''گاؤ ماتا کی رکشا کرو،دان دو،پونیہ کماؤ'' سورج کے چڑھتے لوگوں کی بھیڑ بڑھنے لگی اور اس کی آواز بلند ہونے لگی۔بھیڑ میں سے ایک بھلا مانس نکلا،اس نے گائے کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔پجاری نے گھاس کا گچھا آگے بڑھایا۔بھلے مانس نے گائے کو گھاس کھلائی،مدراسی نے ہاتھ پھیلایا اور آواز لگائی ''آٹھ آنا دو!'' آٹھ آٹھ آنے جمع ہوتے گئے۔بھیڑ چھٹنے لگی،شام کے سائے بڑھ آئے،بچی ہوئی گھاس اس نے گائے کو کھلا دی اور آمدنی گننے لگا۔کل سینتالیس روپے آٹھ آنے تھے۔زندگی کی نئی رمق اس کی آنکھوں میں چمکی اور اپنا پیٹ بھرنے وہ وڑا پاؤ کی ہتھ گاڑی والے کے پاس چل پڑا....اور زندگی چل پڑی....!!

مرکزی خیال۔جناب موہن ناگمنور
اردو قالب مہر افروز

ماں کی بولی

وہ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ زیادہ کی ہوس اسے وقت کے فرعون کے پاس لے گئی، جو خدائی دعویدار تھا۔ اپنی ہوس کو پوری کرنے کے لئے وہ فرعون کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ دوسرے دن اخباری خبر تھی، وہ اکیڈمی کا چیرمین بنادیا گیا۔ وہاں جتنی دھاندلی کرنا تھی کرلی۔ پیٹ بھر گیا ہوس نہیں بھری۔ تین سال کے دورانیے کے خاتمے پر اسے خوف ہوا کہ شاید وہ دوبارہ نہ چنا جائے۔ وہ بڑی بھری سوٹ کیس کے ساتھ فرعون کے قدموں پر سجدہ ریز تھا۔ فرعون بہت خوش ہوا۔ مجھے اگلا نذرانہ بلی (قربانی) کی شکل میں چاہیئے، سوٹ کیس نہیں چلے گا۔ قہقہہ۔ بلند ترین تھا۔ غلام نے سجدے میں سر ہلایا۔ واپسی میں وہ کشمکش میں تھا۔ دوسرے دن اخبار کی سرخیاں دیکھ کر وہ سرور کی بلندیوں پر تھا۔ مرکزی حکومت کی سب سے بڑی اقلیتی زبانوں کی انجمن کی بڑی کرسی پر اسے بٹھادیا گیا تھا۔ دوسال بڑی عیش وعشرت میں گزرے، تیسرا سال شروع ہوا۔ خوف اس پر طاری ہوا۔ اس بار تو مجھے بلی دینا ہے، مگر کس کی۔؟ اب بھی وہ کشمکش میں تھا۔ مگر ہوس پھر غالب تھی گھر بھر میں عیش بکھرا تھا، بچے امریکہ میں تھے، بیوی پارٹیوں میں مشغول تھی۔ گھر کے کونے میں پڑی ماں پر نظر پڑی۔ دنیا کی سب سے بے کار ہستی وہی تھی۔ اپنی قوت، اپنا علم، اپنی زبان، اپنا معیار، اپنی پہچان تک تو وہ دے چکی تھی۔ اب اور کیا لینا تھا اس سے۔؟

بلی کے لئے سب سے بہترین شے وہی لگی۔ وہ اسے لے کر فرعون کے دربار میں پہنچا۔ فرعون خوش ہوا۔ ''مجھے تیری ماں نہیں چاہیئے پاپ لگے گا۔ بس اس کی زبان کاٹ کر میرے چرنوں میں رکھ دے میرے غلام''۔ غلام بے چوں وچرا اٹھا۔ فرعون کے ٹیبل پر پڑی پھل کاٹنے کی تیز چاقو اٹھائی اور ماں کی طرف بڑھا۔ وہ گم صم کھڑی ماں کی عاجزانہ نظریں پڑھ رہا تھا۔ تبھی ہوس کی دیوی نے اس کی آنکھوں پر طمع کے پردے گرادیئے اور اس نے۔

اس کی ماں کی زبان فرعون کے قدموں میں پڑی تھی۔ وہ کرسی، دولت، طاقت، عہدے کے نشے میں چور گھر لوٹا۔ اسے لگا اب وہ بھی ایک قوم کا خدا ہونے جارہا تھا۔

اسے دوسری صبح کے اخبار کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اخبار کی خبر نے آسمان سے زمین پر لا پٹکا۔ کوئی اور ڈایریکٹر کی کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے فرعون کے گھر حاضری دی، سر سجدے میں رکھ دیا مگر اس بار، زور کی لات پڑی۔ ''جو اپنی ماں کا نہیں ہوسکتا وہ ہمارا کیا ہوسکتا ہے، ہمیں وفادار غلام پسند ہیں تمہاری غلامی کا وقت ختم ہوا۔ اب ایسی جگہ جا کر چھپ جاؤ جہاں تمہارا کوئی گھوٹالہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے نہ پہنچ جائے''۔

تعمیرِ نو

وہ عجیب سی آواز تھی، جس سے اس کی نیند ٹوٹی۔ خرخراہٹ تھی کوئی، دبی دبی سی چیخ تھی یا کراہ''! وہ امتیاز نہیں کرسکی۔ وہ آہستہ سے اٹھی، ہڈیاں چٹخ اٹھیں، خود اس کے منہ سے کراہ نکلی، آہ! مگر اس کی کراہ سن کر جاگنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک کمرے کے مکان کا دروازہ اس نے کھولا۔ ابھی اندھیرا تھا، لالٹین سنبھالے وہ باہر نکلی، آواز کی سمت کا تعین کرکے آگے بڑھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا تھا اس نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

''سسی'' اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ تیز ٹھونک نے اس کا ہاتھ زخمی کردیا تھا۔ وہ پیچھے ہٹی واپس کمرے کے اندر چلی گئی۔ ابھی صبح ہونے میں شاید دیر تھی، نیند آنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ کروٹیں بدلتے کچھ ہی وقت گزرا تھا، کہ دور کہیں اذان کی آواز گونجی۔

صبح کے اجالے میں اس نے اسے دوبارہ دیکھا۔ وہ کسی پرندے کا بچہ تھا۔ کیا تھا وہ سمجھ نہیں سکی۔ چیل! گدھ! باز! شاہین؟ اسی قبیل کا کچھ تھا۔ اس کا ایک پر، ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اس کے جھونپڑے کے بازو پڑا پھڑپھڑا رہا تھا۔

''اچھا تو ہے۔؟ چل رہنے دے، خود تو زخمی ہے مجھے بھی زخمی کردیا''!! وہ اس سے ایسے مخاطب ہوئی جیسے کہ کوئی اس کا ہی بچہ کھیل میں زخمی ہوکر گھر آیا ہو اندر آنے سے خوفزدہ ہو کہ ماں کی ڈانٹ نہ سننی پڑے۔

اس نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور وہ دبک گیا۔ مگر اس مرتبہ وہ اسے پکڑ کر اندر لے آئی۔

گرم تیل میں ہلدی ملا کر اس نے اس کے ٹوٹے ہوئے بازو پر لگایا ایک پھٹے کپڑے کی پٹی باندھ دی۔ ''چل اب کچھ دن میں ٹھیک ہو جائے گا''۔ پرندے کے بچے کو ہلکے سے کمرے میں چھوڑتے ہوئے اس کے اندر کی سوئی ہوئی ممتا نے کہیں کروٹ لی۔ بے ساختہ اس کا ہاتھ اس کے اپنے پیٹ پر گیا، تلوار کے گھاؤ تو سوکھ گئے تھے مگر روح کے گھاؤ ابھی کچے اور تازہ تھے۔ وہ لرز گئی۔

وہ بھیانک رات اس کی آنکھوں میں ناچ گئی۔ پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ وہ اس بھیانک یاد سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی مگر کہاں جاتی؟ وہ یاد ہی تو اس کی زندگی تھی! حال بھی تھا، ماضی بھی تھا اور مستقبل بھی، وہ اس یاد سے کبھی نکل ہی نہیں سکی تھی۔

دھڑادھڑ جلتے گھر، گھپ اندھیرے میں روشنیاں ہوگئیں۔ گویا کوئی گہری اماوس کی رات میں دوسروں کے گھر جلا کر اپنی دیوالی منا رہا تھا۔ ہر ہر مہادیو کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ اسی بیچ اس کے گھر کا دروازہ ٹوٹا، وہ حیوان اندر آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچ سمجھ پاتے اس کے شوہر کی گردن دھڑ سے الگ کردی گئی۔ نہ سانس لینے کا وقت ملا نہ آہ کا۔!! اس کا آٹھ سالہ بیٹا اس کے پیچھے چھپا کھڑا تھا، انھوں نے اسے بھی گھسیٹ لیا، چشم زدن میں اس کا لاشہ بھی زمین پر پڑا تھا۔ وہ گم صم بے زبان گنگ کھڑی تھی۔ ہوش اس وقت آیا جب اس کا دوپٹہ کھینچا جا رہا تھا۔

''ابے یہ تو پیٹ سے ہے اس کا کیا کریں؟''

''ارے کرنا کیا ہے! چیر دو پیٹ حرامیوں کی نسل ختم کردو۔ ملیچھوں سے پاون دھرتی پاک کرنا ہے۔ ہر ہر مہادیو۔'' یہ آخری آواز تھی جو اس نے سنی۔ درد کی تیز لہر۔ کسی نے اس کے بھرے پیٹ میں تلوار گھسائی اور بچہ باہر آگیا، بچے کو ہوا میں اچھال کر تلوار کے وار سے ٹکڑے کردیئے گئے۔

اس کی آنکھ کھلی تو وہ کسی اور جگہ تھی۔ اسپتال تھا، کیمپ تھا، کچھ پتہ نہیں تھا مگر آس پاس سے کئی آوازیں آرہی تھیں۔ اسے تو مر جانا چاہیے تھا، شوہر بیٹا اور پیٹ کے اندر کی اولاد تک چیر ڈالی گئی۔ اپنے زندہ ہونے کے احساس پر اسے بہت تکلیف ہوئی۔

سچ ہے مرنا چاہیں تو موت نہیں آتی۔ جب موت آتی ہے تو جینے کی آرزو نہیں جاتی۔

مگر وہ زندہ تھی، کیوں تھی، کیسے تھی، کیا اتنی سخت جان تھی کہ سب کو کٹتا دیکھ کر بھی اسے موت نہیں آئی؟ اس نے بے ساختہ اپنا پیٹ ٹٹولا درد کی تیز لہر اٹھی، سنسناہٹ اور آوازیں۔ پھر وہ بے ہوش ہوگئی۔

ہوش اور بے ہوشی کے دورانیے سمٹتے گئے۔ اور وہ زندہ رہ گئی۔ پتھرائی آنکھوں کے ساتھ جس میں کوئی ہوش اور جذبہ نہیں تھا۔ دو سال اس نے کسی کیمپ میں گزارے۔ جب ضرورتیں زندگی بن جاتی ہیں تو آدمی خود غرض ہو جاتا ہے۔ فساد زدگان کیمپ جہنم بن گئے۔

نفسا نفسی کا عالم! کون کس کو روئے، کون کس پر رحم کھائے؟ سب کے سب قابل رحم!! کتوں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے اور لڑتے، وہ سب انسان کم حیوان زیادہ ہوگئے تھے۔ اور ان تمام کو انسانوں سے حیوان بنانے والے، حیوانوں سے شرفاء بن کر اسمبلی کی سیٹوں پر قابض عیاشیوں میں مصروف تھے۔

وہ ایک ٹینٹ سے دوسرے ٹینٹ دھکیلی جاتی رہی۔ کبھی ہوس بھری نظریں اسے ٹٹولتیں تو کبھی رحم کھا کر اسے کوئی کچھ کھلا دیتا۔ کیمپ میں اس کا آخری ٹھکانہ ایک بوڑھے بابا کا ٹینٹ تھا، جو زندگی کے آخری

دن جی رہا تھا۔ بہت بیمار تھا۔ جب تک وہ حیات رہا وہ اس کی خدمت کرتی رہی۔ پانی پلاتی، جو کچھ ملتا لا کر اس کو پہلے کھلاتی پھر خود کھاتی، اسے اٹھا کر بٹھاتی۔ رفع حاجت کے لئے سہارا دے کر لے جاتی۔ مگر اس بوڑھے کی باتیں اس میں زندگی جگاتی رہیں۔ وہ آہستہ آہستہ حواسوں میں لوٹ رہی تھی۔ جس دن بوڑھے بابا نے آخری سانس لی وہ پورے ہوش میں لوٹ آئی جس کا ثبوت اس کی نم آنکھیں تھیں جن سے اس کا سکوت بہہ نکلا تھا۔ جب سرکاری گاڑی بوڑھے کو دفنانے کے لئے لے جانے آئی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کا رونا تھا کہ قابو میں نہ آتا حتیٰ کہ آنسو ختم ہو گئے۔ شاید اس نے اپنے شوہر کا اور اپنے دونوں بچوں کا ماتم بھی پورا کر لیا۔ تین دن وہ خیمے سے باہر نہیں نکلی۔

ہر درد کا مرہم وقت ہوتا ہے اور بھوک ہر درد پر بھاری ہوتی ہے۔ اس کے پیٹ میں اٹھتے مروڑ اسے خیمے سے باہر لے آئے، کیمپ کے باہر کھانے کے حصول میں لگی لمبی قطار نے اسے مایوس کر دیا۔ وہاں کی چیخ و پکار اور دھکم پیل سے وہ خوفزدہ ہو کر خیمے میں واپس آئی، سوچا بھوکی رہے پر اس ذلت سے نہ گزرے۔

اندر آ کر اس نے بوڑھے کا بستر اور ساری چیزیں چھان ماریں تا کہ کوئی چیز کھانے کو مل جائے۔ سوکھے نان کے کچھ ٹکڑے ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے ملے، جسے پانی میں تر کر کے اس نے کھا لئے۔ اسی تلاش کے دوران اس کی نظر کچھ کتابوں پر پڑی جو بوڑھے نے بستر کے نیچے سنبھال رکھی تھیں۔ ان بہت ساری کتابوں میں کچھ کتابیں رنگین تصویروں سے بھرپور پرندوں سے متعلق تھیں۔ اس نے اوراق پلٹنے شروع کئے، اس کی نگاہ شاہین پر ٹک گئی۔ وہ پڑھی لکھی تھی۔ ایک معلم کی بیٹی اور ایک معلم کی بیوی۔ شاہین کی زندگی کے پل پل کی تصاویر اور لمحے منظرنامے کی طرح اس پر درج تھے۔ بہت دلچسپ چیز جو اسے لگی وہ شاہین کا نیا جنم لینا اور چولا بدلنا تھا۔ جب شاہین چالیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو بوڑھا ہو جاتا ہے، اس کے پر بھاری، چونچ خم دار، سخت اور بدن وزنی ہو جاتا ہے جس سے اس کی اڑان کمزور پڑ جاتی ہے اور وہ اوپر اڑ کر شکار پر جھپٹ بھی نہیں پاتا تب وہ ایک چٹان پر چلا جاتا ہے شاید مراقبے میں۔ پھر اپنی چونچ سے اپنے خود کے پروں کو نوچ نوچ کر پھینکتا ہے، حتیٰ کہ پورے پر جھڑنے کے بعد وہ ننگا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے نئے پر نکلنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی چونچ کو چٹان پر مار مار کر توڑ دیتا ہے اور نئی چونچ کے اگ آنے کا منتظر رہتا ہے۔ اس تبدیلی کا دورانیہ چھ ماہ کا ہوتا ہے جس دوران شاہین زیادہ تر بھوکا رہتا ہے۔ جب اس کے نئے پر چونچ نکل آتے ہیں تو وہ اپنی نئی اڑان بھرتا ہے۔ یہ اڑان اس کی پہلی اڑانوں سے بہت بہتر ہوتی ہے، کیونکہ اس کی اس اڑان میں نئی توانائیوں کے ساتھ اس کا پرانا تجربہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اس

کے بعد وہ تیس سال اور جیتا ہے۔ وہ زندگی پہلی چالیس سالہ زندگی سے زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ شاہین سے متعلق یہ معلومات اس کے لئے نئی و شاندار تھیں۔ پتہ نہیں اس کے اندر کن حوصلوں نے سر اٹھایا تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی نئی بصیرتوں سے چمک رہی تھیں۔ وہ بھوکی اور فاقہ زدہ ہونے کے باوجود اندر سے توانائیاں محسوس کرنے لگی۔

زندگی کو گزارنا تھا، اس نے آس پاس کی جھونپڑیوں اور کچے مکانوں میں جاجا کر بچوں کو بلانا شروع کیا، پھر ان سے باتیں کرنا اور انھیں کہانیاں سنانا اور کچھ پڑھانا شروع کر دیا، بدلے میں لوگ اسے کچھ کھانا یا روٹی لا کر دیتے، جس میں وہ قناعت سے خوش رہتی، مگر اس کا مشن تیز ہونے لگا ساری جھونپڑیوں کے بچے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔

رفتہ، رفتہ، کیمپ کے کچھ جیالوں نے مل کر قریبی پہاڑ کے دامن میں کچھ جھگیاں اور جھونپڑیاں کھڑی کر لیں تاکہ کیمپ زدگان وہاں منتقل ہو سکیں۔ اس کے حصے میں بھی یہی ایک کمرے کا سائبان آیا تھا جس میں وہ فی الحال مقیم تھی۔

ہزاروں جھٹکوں اور زلزلوں کے بعد زندگی ٹھہر گئی تھی وہ اس کچی نئی بستی کے بچوں یعنی نئی نسل کی استانی تھی۔ اس بستی میں کوئی اسکول تو نہ تھا، جہاں نوالوں کے لالے پڑے ہوں، وہاں تعلیم کی کیا ضرورت۔ مگر شاید اس کی بصیرتوں اندرونی آگہی نے اس کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ سو وہ ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی۔ اسے ان بچوں کو انسان بنانا تھا۔ ان کو ان کی ''بہترین تخلیق'' کی شناخت دینا تھی۔ وہ سارا دن بچوں کو جمع کر انھیں کہانیاں سناتی، ان کو وہ نغمے اور گیت سناتی جو اس کا بیٹا گایا کرتا۔ بچوں کو سارا دن مشغول رکھتی۔ بدلے میں بستی کے لوگ اس کی معمولی ضرورتوں کا دھیان رکھتے۔

آج بچوں کے ساتھ یہ نیا مہمان آ گیا تھا۔ سردیوں کی سست دھوپ نے اس کے کمرے میں زرد روشنی بھر دی بچوں کی آوازوں نے اسے ماضی سے حال میں لوٹا دیا۔

''باجی کہانی۔!'' وہ سب چلاّ رہے تھے۔

''ہاں ہاں کہانی۔ پہلے ہاتھ پیر دکھاؤ! جس جس کے ہاتھ پیر پاک ہیں، وہ بیٹھیں، جو گندے ہیں وہ باہر جا کر ہاتھ پیر دھو آئیں'' اس کی آواز میں دنیا جہاں کی بشاشت تھی حالانکہ وہ ہزاروں میل ماضی میں پیدل چل کر آئی تھی۔ کچھ بچے کھلکھلاتے ہوئے باہر کو بھاگے۔

بچوں کے ساتھ وہ اس نئے مہمان کا خیال بھی رکھتی، جب اس نے دیکھا کہ وہ کھانے کے دانے

اور سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے نہیں کھاتا تو بچوں کے جانے کے بعد وہ زندہ کیڑے کینچوے ڈھونڈ لاتی جسے وہ کھالیتا۔ پھر کبھی کبھی وہ پھدک پھدک کر باہر چلا جاتا اور شام بھرے پھر واپس لوٹ آتا۔

ایک دن اچانک وہ غائب ہوگیا۔ تین دن کے بعد اس نے دیکھا آسمان سے کچھ نیچے اتر رہا ہے۔ وہ اس کی خستہ چھت پر اترا۔ اسے اڑتا دیکھ ویسی ہی خوشی ہوئی جس دن اپنے بیٹے کو پہلا قدم اٹھا کر چلتے ہوئے دیکھ کر ہوئی تھی۔ پھر کئی کئی دن غائب ہونا اور لوٹ آنا اس کا معمول بن گیا مگر جب بھی آتا کمرے کے اندر نہیں وہ چھت پر بیٹھتا۔ وہ بھی بستی کا فرد بن گیا اور سب بچوں کی باجی کا شاہین۔

ایک دن اس نے دیکھا اس کے پنجوں میں سانپ تھا جسے چھت پر لا کر بیٹھا وہ کھا رہا تھا۔ اس کے اندر انجانا سکون بھر آیا اسے لگا اس کا محافظ موذی کو کچلنے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔

لمحے گھنٹوں میں، گھنٹے دنوں میں، دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے، مہینے کیلنڈر کے پنوں کی طرح بدل کر سال بنتے گئے اور رینگتی زندگی چلنے لگی۔ اس بستی میں جھونپڑیاں مکانوں میں، مکان پکی عمارتوں میں تبدیل ہونے لگے۔ کئی تنظیمیں آگئیں۔ گھریلو دستکاریاں، اسکول، مدرسہ اور مسجد بھی بن گئی۔ مگر فرق یہ تھا کہ مسجد میں کوئی تفرقہ نہیں تھا، نہ مسلک تھا، نہ آپس میں چپقلش تھی۔ وہ صرف محنت کرتے، دن بھر کماتے اور آپس میں مل بانٹ کھا کر سوتے، متفق انسان تھے۔

ایک دن اچانک بستی کا سارا ماحول دھویں سے دھندلا گیا۔ سبھی کھانستے کھانستے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے، ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے، سارے دھوئیں کی جانب چلنے لگے۔

دھویں کا منبع کچرے کا وہ ڈھیر تھا جو کچھ مہینوں سے شہر والوں نے ان کی بستی کے آگے جمع کر دیا تھا اور شاید آج اس کچرے کے پہاڑ کو آگ لگا دی گئی تھی۔ کچرے کا جلتا ڈھیر، آگ کی تیز لپیٹیں، دھویں کے گہرے کالے مرغولے.... ان کی چلتی زندگی کھانسنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ ان کے پاس اس نئی قیامت سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کچرے کے ڈھیر کو آگ لگا کر شہر میں داخلے کا راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ ان کی بستی کی پشت پر پہاڑ تھا، جس پر چڑھنا ناممکنات میں سے تھا اور تیسری طرف سمندر تھا جس میں جا گرتے تو موت یقینی تھی۔

یہ سوچی سمجھی چال تھی۔ دوسری مرتبہ ان پر اجتماعی طور پر عرصہ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ بیک وقت مسلمانوں کی یہ بستی جو ہزاروں پر مشتمل تھی ختم ہو جائے۔ اللہ اللہ کر کے ہزاروں کوششوں کے بعد تیسرے دن آگ تھمی۔ کھانستے کھانستے ان کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ سانس لینا محال تھا، سب کے

سب بے دم ہو گئے تھے۔

ان میں سے کچھ جیالے پھر اٹھے اور پہاڑ پر اوپر چڑھ کر جھونپڑیوں کی تعمیر دوبارہ شروع کر دی۔ ننگے پہاڑ پر پودوں کو اگانے کا کام بڑی سرعت سے شروع کر دیا۔ وقت اسے تھکا رہا تھا مگر پہاڑ کے دامن میں بنی جھونپڑی پر اس نے منتقلی منظور کر لی۔ پودوں کی رکھوالی اور پانی دینے کی ذمہ داری کو بھی اُس نے قبول کر لیا۔ سارا دن خود کو اسی کام کے لئے مصروف کر لیا۔ اس کی بستی کی دوسری نسل اس کی کہانیاں سن رہی تھی۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے پودے بھی لگا رہی تھی۔ مہینوں میں بستی، دامن سے پہاڑ پر منتقل ہو رہی تھی۔ ایک دن کچھ پودے لے کر وہ پہاڑ کی بہت اونچائی پر پہنچی تا کہ پودے لگا سکے۔ اس نے پھڑ پھڑاہٹ کی آواز سنی۔ کوئی بوڑھا شاہین تھا۔ شاید وہ بوڑھا ہو رہا تھا اور تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ پروں کو نوچ نوچ کر نکال رہا تھا اس کی چونچ خون سے لال تھی، بہت تکلیف دہ عمل تھا۔ اسے بوڑھے بابا کی وہ کتاب یاد آئی جو بوسیدہ حالت میں اب بھی اس کے پاس موجود تھی۔

تبدیلی کے اس عمل میں پہاڑ ہرا ہوتا رہا، شاہین پروں کو نکال پھینکتا رہا اور یہ پہاڑ پر آباد ہوتے رہے۔ اس کے جیالے بچے بلند حوصلوں والے جیالے نوجوان بن گئے تھے جو پہاڑ کو آباد کر رہے تھے۔

چند دنوں میں بوڑھے شاہین کے نئے پر نکل آئے۔ جنگل کے پودے بڑے ہونے لگے اور پہاڑ گلزار بن رہا تھا، نیچے کی ساری بستی خالی ہو کر پہاڑ کی بلندیوں پر آباد ہو گئی تھی۔ گندگی کے ڈھیر کے جلنے سے دھواں اب بھی آتا، بدبو کے مرغولے بھی آتے، مگر تیزی سے پروان چڑھ رہے پودوں سے ٹکرا کر ختم ہو جاتے۔ وہ اب محفوظ تھے، اپنے کچے مکانوں میں نہیں بلکہ اس سوچ اور حوصلوں میں، جو ہر مصیبت میں خود کو سنبھال سکتی تھی۔ پھر ایک دن اس شاہین نے نئی اڑان بھری جو اتنی شاندار تھی کہ بس سب دیکھتے رہ گئے۔

وہ سب سمجھ گئے، تبدیلی زندگی کا حصہ ہے ہر بھاری چیز جو خود پر مسلط ہو جائے جب تک اس سے چھٹکارا حاصل کر کے نئی تبدیلی اور اقدار کو حاصل نہیں کرتے، جینا محال ہو جاتا ہے۔ زندگی دائم نہیں ہے لیکن جب تک زندگی ہے ہارنا بھی نہیں ہے۔ ہر لمحہ نئی اڑان بھرنے کے لئے خود کو تیار رکھنا ہے، بالکل باجی کے شاہین کی طرح۔ اب وہ ہر اڑان کے لئے تیار تھے، ان کی باجی نے ان کو پرانی بھاری سوچوں سے آزادی دلا کر نئے حوصلوں کی اڑان دی تھی۔

طلسماتی ٹوپیاں

کچھ پڑھتے پڑھتے اچانک مجھ پر کب نیند کی دیوی مہربان ہوئی مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ میں جینیوا میں ایک بین الاقوامی ادبی سیمینار میں تھی۔ بڑا سا آڈیٹوریم، ہزار لوگوں کی گنجائش کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اپنے ملک کا ٹیگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر میں ہانپ رہی تھی۔ اینکر کی آواز میرے کانوں میں مسلسل گونجتی رہی جو سارے ملکوں سے آئے مندوبین اور مقالہ نگاران کو بہت زیادہ لفاظی کے ساتھ خیر مقدم کر رہا تھا۔ اپنے ملکی کارنر پر پہنچ کر مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ تمام تر ہم ملکی ایک لباس میں نہیں تھے، اگر رنگا رنگ لباس میں ہوتے تب بھی ٹھیک تھا، یہاں معاملہ عجیب تھا کچھ کیسریا رنگ کے چوغوں میں تھے، کچھ سفید، کچھ سبز، کچھ سرخ تو کچھ سیاہ، کچھ ایک تو ان تمام رنگوں کی پٹیوں سے بنے دھاریوں کے چوغوں میں تھے۔ سب کے سروں پر ٹوپیاں بھی چوغوں کی رنگت سے مناسبت رکھتی تھیں۔

پڑوسی ملک کے حلقے پر نظر پڑی تو وہاں بھی عجیب تماشہ تھا، جو میرے اپنے ملک کے تماشے سے مختلف نہ تھا۔ کوئی ہرا، کوئی سفید، کوئی نارنگی، کوئی کتھئی، کوی سرخ اور سیاہ چوغے میں ملبوس تھا۔ ساری سفید فام مخلوق ایک جیسے سوٹوں میں ملبوس تھی اور چوتھی دنیا کی اس رنگ برنگی آبادی کو جو اپنی قوم کے روشن دماغوں کا ٹولہ تھی، دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ مگر ہر سفید فام کے ہاتھ ٹوپیوں کے مختلف ڈھیر تھے، جو انھوں نے اٹھار کھے تھے جیسے کوئی کتابیں اٹھالیتا ہے، جیسے ہی شہہ نشین پر جلوہ نشین ہونے والوں کی آمد کا غلغلہ ہوا، نیچے بیٹھے یہ رنگ برنگی کیڑے، کچھ دیر بھنبھنا کر اپنی آقاؤں کی آمد پر اد باً خاموش ہو گئے۔ انکل سام جو جلسۂ ادب کے مہمان خاص تھے، ان کا پر جوش استقبال ہوا، سفید پھول، سفید چوغہ اور سفید ٹوپی ان کی زینت اور نکھار میں اضافہ کر رہے تھے۔ سب ادباً آدھے خم ہو گئے۔ پھر عجیب سی سریلی سرمست دھن نے سب کے ذہنوں کو دھیرے دھیرے ماؤف کر دیا۔ پھر ہر کوئی اپنے سوچنے سمجھنے کی طاقت سے محروم ہو گیا۔ پھر آسمانی الوہی صدا کی طرح انکل سام کی آواز گونجنے لگی، جو آئندہ آنے والی صدی میں سب کی یکسانیت، سب کی برابری، کائناتی اکائی، کروی تجارت اور یکساں سول کوڈ، یکساں قانون، عالمی برادری کا اسم بار بار پڑھ کر ان کو ازبر کرواتے رہے۔ سفید فاموں کی کوتاہ قد نسل ان کو جادوئی مشینوں کی افادیت اور دولت کے انباروں کے خواب دکھاتی رہی۔ ہر مقالہ ایک سنہری دنیا کے خوابوں کے در، ان پر، وا کرتا رہا اور وہ سارے اس طلسماتی خوابناک دنیا میں اسیر ہوتے رہے۔ میرے ملک سے گیروے اور پڑوسی ملک کے سبز چوغہ برداروں کی تہنیت کی گئی اور نذرانے

کی کثیر رقم بھی ان کے حوالے کر کے ان کے چوغے اتار کر ان کو برہنہ کر دیا گیا۔ ان کو اپنی برہنگی پر بہت ناز تھا کہ وہ، آزاد ہو گئے۔ پھر وہ سفید فام جنھوں نے ٹوپیاں اٹھا رکھی تھیں، آگے بڑھے اور برصغیر والوں کو یکساں ٹوپیاں پہنانے لگے۔ جس پر لکھا تھا ’صارفیت، تجارتی منڈی، لکشمی کا حصول سب سے بڑا اصول‘۔

چپٹی ناکوں والی قوم جو سرخ چوغے پہنے ہوئے تھی ان کو کاریگری اور صناعی کا منتر پڑھایا گیا اور اس سے متعلق ٹوپیاں پہنا دی گئیں۔ پھر منظر بدل گیا کسی بین الاقوامی منڈی کا ماحول تھا، جہاں چپٹی ناک کی پستہ قد قوم چیونٹیوں کی طرح کام کر رہی تھی، صناعی کے مختلف جادوئی سامان کا ڈھیر لگا رہی تھی، سارا گندمی رنگت، صارفیت کی ٹوپیوں والا ہجوم ان کو خرید کر ان کے طلسم میں گم ہو رہا تھا۔ خود کی سدھ بدھ کھو رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے چپٹی ناک والی قوم کے پاس پیسوں کے انبار لگ گئے۔ ”لکشمی کا حصول سب سے پہلا اصول“ والوں کی ساری لکشمی دوسری جانب منتقل ہو گئی۔ اتنی کہ ان کو خوف ہونے لگا کوئی ان کی لکشمی کو لوٹ نہ لے۔ مگر جیسے ہی وہ مڑے ان کے پیچھے سفید چوغوں والے لوگ دوبارہ نظر آئے، انھوں نے بڑے بڑے صندوق ان کے آگے کر دیئے اور کہا اپنی لکشمی محفوظ کر لیں۔ چپٹی مستطیل نما عجیب سی چابی ان کے حوالے کر دی گئی اور کہا گیا کہ وہ اسے جہاں ڈال کر نمبر دبائیں گے وہیں ان کی لکشمی پر کٹ ہو جائے گی اور فوراً درشن دے دے گی۔

کچھ دیر گزری نہ تھی کسی ہوش میں آتے بوڑھے سیانے نے آواز دی۔

”ارے او بے وقوفو تمہاری لکشمی کے صندوق تو وہ لے گئے، تم بناتے رہے وہ خریدتے رہے اور ساری لکشمی ادھر سے ادھر کر دی، اور وہ اسے لے کر چمپت ہو گئے۔ پھر دونوں قوموں کے لوگ آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے کو الزام دینے لگے۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔

دور بیٹھے انکل سام نے دیکھا، دونوں برسرِ پیکار قومیں ان کے لئے بے کار ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا کھلونا اٹھایا اور اس کا بٹن دبا دیا۔ منڈی میں بھگدڑ مچ گئی، جگہ جگہ دھماکے ہونے لگے اور لوگ جان کی امان پانے اور پناہ کی تلاش میں دوڑنے لگے۔ کہیں کوئی امان نہ ملی تو واپس آ کر انکل سام کے قدموں میں گر گئے کہ وہ انھیں کوئی دوسرا منتر دے۔ تا کہ وہ پھر سے مشغول ہو سکیں۔

”ارے کب تک سوؤ گی کالج نہیں جانا ہے کیا۔؟“ اماں مجھے آواز دے رہی تھیں۔

یونیورسٹی گیٹ سے کالج میں داخل ہوتے وقت میری نظر بے ساختہ اپنے کالج کے بورڈ پر پڑی۔

”بیسک اسکول آف بزنس مینجمنٹ اسٹڈیز آف اوورسیز“۔ مجھے میرا خواب یاد آیا۔ انکل سام نے آخری سجدے کے بعد یہی تختی میرے ہاتھ میں دی تھی۔

ٹفن باکس

عید کی تیاریوں میں سب سے پہلی تیاری گھر کی صفائی کی ہوتی ہے۔وہ بھی سب سے پہلے کچن کی۔ خاتون خانہ کی جاگیر اور اس کی حکومت کا تخت ،ہمیشہ باورچی خانہ ،رسوئی گھر یا کچن ہی ہوتا ہے۔اسے چمکائے رکھنا اس کا شوق اور کبھی کبھی جنون بن جاتا ہے۔سفینہ بھی یہی کر رہی تھی۔اپنی ملازمہ اور چھوٹی بیٹی کے ساتھ مل کر کچن صاف کروا رہی تھی۔کچھ بڑے بڑے باکس رکھے تھے جس میں غیر استعمال شدہ برتن اوپر اٹھا کر رکھ دیئے گئے تھے۔اس نے اپنے شوہر کو آواز دی کہ وہ آکر باکس اتار دیں تاکہ اس میں موجود برتنوں کو چمکا کر دھوپ میں سکھا کر دوبارہ بکسوں میں بھر کر رکھوا دے۔

پہلا بکسہ اس نے کھولا۔اپنی حرص پر پچھتائی کہ اتنے سارے برتن بےکار میں جمع کر رکھے تھے۔یہ اس وقت کی بات تھی جب گھر بھرا پرا تھا۔بڑے دونوں بچے ساتھ تھے۔ساس رہتی تھیں۔ساس کو ملنے دیور، دیورانی، نندان کے بچے سب آیا کرتے۔عید کا مزہ تو اسی وقت آتا۔

وقت کیسے مٹھی میں بند ریت کی طرح پھسل گیا، پتہ ہی نہیں چلا۔بچوں نے تعلیم مکمل کرلی، اپنے پیروں پر کھڑے بھی ہوگئے، انھوں نے بڑے دونوں بچوں کی شادیاں کردیں۔دونوں نے اپنی اپنی گرہستی الگ بسالی۔پچھلے سال، ساس بھی عدم سدھار گئیں۔اب بس تین لوگ تھے۔وظیفہ یاب شوہر، چھوٹی بیٹی، جس کی شادی ہونا باقی تھی اور وہ خود۔اس سال عید پر تو کوئی آنے والا نہیں تھا، کرونا کا قہر جو پھیلا ہوا تھا۔اس نے یہی بہتر سمجھا کہ برتن دھو کر سکھا کر دوبارہ بکسے میں بھر کر اوپر رکھوا دے۔

دوسرا بکسہ اس نے کھولا تو اس میں سے کچھ یادیں نکل آئیں۔اماں کا چاندی کا پاندان۔جڑی بوٹیوں والا ڈبہ، اماں کو یاد کر کے اس کی آنکھیں چھلکنے کو تھیں کہ اچانک بکسے میں موجود دو کھانا گرم رکھنے کے ملٹن ٹفن باکسز پر اس کی نگاہ پڑی اور آنسو بہہ نکلے۔کتنے ارمانوں سے اپنی ضرورتوں کو مار مار کر اس نے یہ دو ٹفن بکس اپنے بڑے دونوں بچوں کے لئے خریدے تھے۔مگر اس کے شوہر نے ان ٹفن بکسوں کو نمائشی خانے میں کراکری کے ساتھ رکھوا دیا، یہ اعلان کر کے کہ نند کے دونوں بچوں اور دونوں بڑے بچوں

میں سے جو کوئی 99٪ کرے گا اسی کو بکس انعام میں ملے گا، کم مارکس لینے والوں کو نہیں۔ اس کے بچے جو گرم ٹفن بکس کے کو دیکھ کر بہت خوش تھے، ان کے چہرے اتر گئے۔

اس سال کے امتحانات ہوئے، چاروں میں سے کسی نے بھی ننانوے فی صد مارکس نہیں لئے۔ دس بارہ سال گزر گئے۔ بڑی بیٹی ڈاکٹر بن گئی، بیٹا انجنیئر بن گیا۔ نند کے بچوں نے ایم سی اے اور ایم بی اے کر کے ملازمت اختیار کرلی۔ بچوں کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ کراکری ٹوٹتی، بدلتی رہی۔ ٹفن بکسز وہیں رکھے رہ گئے۔ ساس کے انتقال کے بعد اس نے ساری غیر ضروری چیزیں ان دو بڑے بکسوں میں بھروا کر اوپر رکھوا دیں تھیں۔

صبح سے کام کرتے کرتے وہ سب تھک گئے تھے۔ آخری بکسہ بند کرنا باقی رہ گیا تھا، اچانک اس نے اپنی ڈاکٹر بیٹی کی کار کا ہارن سنا اور باہر آ گئی۔ ماں کا تھکا چہرہ دیکھ بیٹی اسے کچن میں لے آئی تاکہ اپنے ساتھ لایا کھانا پروس سکے۔ کھلے بکسے میں موجود ٹفن بکسز کو دیکھ کر اس کی بیٹی کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ چلائی۔ ''امی آپ نے ان ٹفنز کو ابھی سنبھال رکھا ہے؟ کس کے لئے؟ ننانوے فی صد لانے والوں کے لئے؟ کیا زندگی کے لئے مارکس اتنے ضروری ہیں؟ ہم بنا ننانوے فی صد کے کامیاب اور اچھے انسان نہیں بنے؟''

اس کی بیٹی نے جھک کر بکسے میں سے وہ دونوں ٹفن بکس نکالے اور ملازمہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ یہ تم اپنے بچوں کے لئے لے جاؤ تاکہ وہ پڑھ لکھ کر اچھے انسان بنیں۔ پھر وہ تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گئی۔ سکینہ نے دیکھا اس کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔

چنّما ایکسپریس

بوتل کا آخری پیگ گلاس میں اُنڈیل کر اس نے اپنے حوصلے سمیٹے، اپنی آفس کی گاڑی کی چابی اٹھائی اور پورے جوش سے ریلوے اسٹیشن روانہ ہوا۔ رانی چنما ایکسپریس کی بوگی نمبر نائین کا برتھ نمبر 6 اس کا منتظر تھا۔ تیز رفتار چنّما ایکسپریس کی رفتار اور شور میں اس کے سارے وسوسے دب گئے اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے گہری نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ رات کا پہلا پہر طبعی ضرورت نے گہری نشیلی نیند سے اسے بیدار کیا۔ ملگجے اندھیرے میں اس نے اپنی آنکھیں مل کر دیکھا، اس کی مخالف سیٹ پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ پیلا شرٹ سیاہ ٹراؤزر، قد چھ فٹ تین انچ، سلیپر سیٹ کی لمبائی سے باہر نکلتے قد، نکلتے پاؤں جسے اس نے کبھی سمیٹنے اور اندر دھکیلنے کی کوشش کی تھی، کھلے تھے۔ چہرے پر کھلی مسکراہٹ کی وجہ پوری سفید بتیسی اندھیرے میں واضح تھی۔ چھ سال کے بعد بھی یہ یہاں کیسے، اس کا نشّہ ہرن ہوگیا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، جس سے ٹرین کی چھت سے اس کا سر ٹکرا کر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ ''کیوں ساونت کیسے ہو؟ آخر اسی سیٹ پر آگئے جس پر مجھے لٹا کر گئے تھے۔ !!!'' اُسکے سامنے کی سیٹ والا سایہ اُس سے مخاطب تھا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا اس کی ٹراؤزر اندر سے گیلی ہو رہی تھی۔

اُسے وہ منظر اُسے یاد آیا ''کمینے، حرام کے پِلّے، ملیچھ، مشٹنڈے میری ہی بیوی ملی تھی ہاتھ ڈالنے کے لئے'' فحاش گالیوں کے ساتھ اس کے ہاتھ پیر مسلسل چل رہے تھے۔ اور مشٹنڈا زمین پر پڑا مسکرا رہا تھا۔ ''اپنی بیوی سے پوچھ وہ مجھ پر ہی کیوں آ کر گرتی ہے۔ دفتر کا سارا اسٹاف جمع ہو چکا تھا بیچ بچاؤ ہوا بات آئی گئی ہوگئی۔

زمین پر سب سے زیادہ معاف کرنے والے شاید شرابی ہی ہوتے ہیں۔ وہ دونوں پھر سے ہم پیالہ ہم نوالہ ہوگئے۔ تیرہ جون 2013 کی اندھیری رات میں تین سائے لڑھکڑاتے ہوئے رانی چنّما ایکسپریس کی بوگی نمبر 9 میں سوار ہوئے۔ پیلی شرٹ کالی ٹراؤزر چھ فٹ تین انچ والے جواں سال کڑیل لڑکے کو اوپری برتھ نمبر 6 پر لٹا دیا گیا۔ اس کے پیر اندر کی جانب سرکا دیئے گئے۔ جس کی اوپری جیب میں اگلے سو کلو میٹر والے شہر تک کا ٹکٹ تھا۔ دو اور سائے بارش کی تیز دھاروں میں بھیگتے ٹرین کے اگلے اسٹیشن پر اتر گئے۔

14 جون 2013 وقت دو پہر ایک بجے متعلقہ دفتر کی گھنٹی بجی، آپ کے دفتر کا آئی کارڈ رکھنے والے

ملازم ضمیر احمد کی نعش رانی چنمّا ایکسپریس کی بوگی نمبر 9 کی اوپری برتھ نمبر 6 پر ملی ہے۔لاش کی جیب سے شناختی کارڈ ملا ہے۔نعش سینٹ مارتھا اسپتال کے سرد خانے میں موجود ہے۔اگلی کارروائی کے لئے آکر شناخت کی تصدیق کریں۔

14 جون سن دو ہزار انیس،اسی متعلقہ دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔"آپ کے دفتر کا شناختی کارڈ رکھنے والے 5 فٹ دس انچ کے شخص کی نعش جس کا نام راکیش ساونت لکھا ہوا ہے چنمّا ایکسپریس کے بوگی نمبر 9، اوپری برتھ نمبر 6 پر ملی ہے،جس کے ساتھ تین سروس رجسٹر بھی ملے ہیں۔نعش سینٹ مارتھا اسپتال کے سرد خانے میں موجود ہے،سروس رجسٹر ریلوے پولیس کے پاس محفوظ ہیں۔اگلی کارروائی کے لئے کسی ذمہ دار متعلقہ افسر کو روانہ کیا جائے۔"فون لینے والے شخص کے ہاتھ سے چونگا چھوٹ گیا اور وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

بھگوان

وہ بہت تھکی ہاری چل رہی تھی۔ قدم اور بدن تھکن سے چور تھے۔ مگر رک نہیں رہے تھے۔ آٹھ بجے سے پہلے نہیں پہنچی تو ہسپتال کا دروازہ بند کردیا جائے گا اور اس کا شوہر بھوکا سو جائے گا۔ اسی ایک خیال نے اس میں پھر سے جان بھردی اور اس کے قدم تیز ہو گئے۔

ساوتری ایک مزدور عورت تھی۔ اس کا شوہر اینٹ گارے سے عمارتوں کی تعمیر کا کام کرتا اور یہ سیمنٹ، اینٹ ڈھونے یا پھر اٹھا کر دینے کا کام کرتی۔ دو سال کا بچہ تھا، جسے اس کی ساس گھر پر سنبھالا کرتی، جو موتیابند سے تقریباً اندھی ہو رہی تھی۔

ہفتہ بھر قبل شیوپاّ چار منزلہ عمارت سے گر پڑا۔ اس کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ عمارت کے مالک نے سرکاری اسپتال میں بھرتی کروادیا، جہاں اس کا آپریشن ہوا تھا۔ اب کھانا گھر سے لاکر دینے کی بات ہوئی تھی۔ ساوتری دن بھر کی مزدوری کے بعد جلدی جلدی اپنی جھونپڑی پہنچی، روٹی اور سالن بنا کر ساس کو دیا۔ ڈبے میں کھانا لے کر جلد از جلد اسپتال پہنچنے کی کوشش میں قدم تیزی سے اٹھا رہی تھی۔ کچھ دیر کے لئے سڑک کی بتی اچانک گل ہوگئی۔ اسے اسپتال کی بتیاں، جو دکھائی دے رہی تھیں وہ اچانک اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اندازے سے چلتی رہی۔

اُسی وقت کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ دوسرے دو ہاتھوں نے اسے دبوچ لیا۔ دو اور ہاتھوں نے اس کے پیر پکڑ کر اٹھا لئے۔ پھر سے بجلی آ گئی۔ ساوتری کی بند ہوتی آنکھوں نے اپنے بدن پر تار، تار، ساڑھی دیکھی، ہاتھ سے لڑھک کر دور جا گرے ٹفن باکس پر اس کی نگاہ پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کسی زوردار مار نے اسے گہرے اندھیرے میں ہمیشہ کے لئے دھکیل دیا۔

''سر نعش مل گئی ہے۔ عمر تیس سال کے آس پاس ہے اور لاوارث ہے۔ ابھی تک کوئی نعش کو حاصل کرنے نہیں آیا۔ آپ کی ہدایت مطابق دل، گردے، کلیجہ اور آنکھیں میں نے نکال کر احتیاط سے رکھ لی ہیں۔''

''کتنی قیمت ہوگی؟'' فون پر دوسری آواز استفسار کر رہی تھی۔

''سر ان تین شکاریوں کے تین لاکھ، پولیس کے ایک، میرا ایک، حادثاتی موت کی رپورٹ بنانے

کے لئے سرکاری اسپتال کے ڈاکٹر صاحب کا بھی ایک۔ڈاکٹر صاحب بات نہیں کرنا چاہتے اسی لئے مجھے معاملہ طے کرنے کہا ہے۔"

"ٹھیک ہے منظور،کل احتیاط سے ساری اشیا جارس میں رکھ کر دواخانے پہنچا جانا۔"

دوسری صبح اسپتال میں وینٹی لیٹر اور ڈائیلاسیز پر پڑے سیٹھ دین دیال کی فیملی کے لوگوں سے ایک فرشتہ صورت ڈاکٹر سفید لباس میں بات کر رہا تھا۔

"آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ مطلوبہ اعضاء مل گئے ہیں۔ہم دو ایک دن میں ٹرانسپلانٹ کا آپریشن کر سکتے ہیں۔بس آپ کے والد کچھ ہمت کر لیں۔تیس سال کی جوان عورت حادثے میں مرگئی ہے۔لواحقین کو بھی کچھ دینا ہوگا۔غریب لوگ ہیں۔"

"کتنا دینا پڑے گا ڈاکٹر صاحب۔؟بس پاپا بچ جائیں پیسے کی آپ فکر نہ کریں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے دس لاکھ اس عورت کے رشتہ داروں کے اور پچاس لاکھ کلیجے اور کڈنی کے۔باقی کا آپریشن کا خرچ۔ایک کروڑ کی رقم آپ اسپتال کے دفتر میں جمع کرا دیں۔"

دس دن کے بعد سیٹھ دین دیال نے آنکھیں کھولیں۔اپنے اطراف کھڑے اپنی بیوی اور بچوں کو دیکھا۔بھگوان کا شکر ادا کیا کہ ایک اور بھگوان کی زمینی کوششوں نے ان کو دوبارہ جینے کا موقعہ دیا۔

پوری عقیدت مندی سے آنکھوں میں آنسو بھرے انھوں نے ڈاکٹر مہیش دیسائی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔کہا"آپ میرے لئے بھگوان ہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔!!"

سیٹھ دین دیال کی بیوی اور بچوں نے بھی عقیدت میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔فرشتہ صورت ڈاکٹر کی مسکراہٹ کریہہ ہوگئی۔

سیٹھ دین دیال کے بیٹے کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے انھوں نے کہا"ارے میں تو صرف ڈاکٹر ہوں سب اس اوپر والے کے کھیل ہیں۔"بہت شان سے نپے تلے قدم اٹھاتے وہ اگلے سیریس مریض کی طرف بڑھ گئے۔

بدلاؤ

وہ بیوی کو سائیکل چلانا سکھا رہا تھا جو کھاتے پیتے گھرانے کی ضرورت سے زیادہ صحت مند لڑکی تھی۔گھنٹہ بھر تک وہ اس کے پیچھے سائیکل پکڑے بھاگتا رہا مگر کسی طرح وہ بیلنس کرنا سیکھ نہیں سکی۔

اس نے چڑ کر کہا ''اپنے باپ کے گھر سے سیکھ کر آتی میری چھاتی کا بوجھ کیوں بن گئی ؟؟؟ گھر چلو بڑی آئی سائیکل سیکھنے والی....''

وہ کبھی سائیکل نہیں سیکھ پائی نہ اس نے اسکوٹر چلانے کی جرأت کی، البتہ یہ ضرور کیا کہ افسر بنتے ہی اس نے گاڑی سیکھ کر نئی برانڈ ڈ گاڑی خرید لی۔

کل وہ پھر سے اپنی ان پڑھ بیٹی کو سائیکل سکھا رہا تھا۔

بوڑھا ہوتا بدن تھک رہا تھا....

'' سیدھے بیلنس کر میں نہیں پکڑنے کا اب۔ گر کر مر گئی تو یہیں سے لے جا کر دفن کر دوں گا، پھر گھر واپس جا کر نہا لوں گا!!''

بچی نے مڑ کر دیکھا۔''بابا گھر چلو مجھے سائیکل نہیں سیکھنی....اب پتہ چلا اماں آپ کے ساتھ کیوں نہیں ہے۔''

مہر افروزؔ دکن کی خاتون افسانہ نگاروں میں ایک روشن ستارہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مہر افروز ایک ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افسانہ نگار ہیں جو عالمی سطح پر بھی اپنی ایک منفرد پہچان رکھتی ہیں۔آپ نے افسانہ نگاری اور بلاگ نگاری کے علاوہ رسالہ ''خرمن'' کی ادارت کے توسط سے بھی اپنی صحافتی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

مہر افروزؔ کے افسانوں میں ہر چند کہ براہِ راست پند و نصیحت سے احتراز ملتا ہے تاہم ان کے افسانوں کے بین السطور میں بانظرِ غائر دیکھا جائے تو کہیں نہ کہیں تشکیلِ معاشرہ اور تعمیرِ اخلاق کا عنصر مضمر معلوم ہوتا ہے۔ان کے افسانے کے بیشتر موضوعات ایک دم نئے تو نہیں کہے جا سکتے لیکن ان میں نسائی حسّیت اور عصری شعور کی آمیزش سے جس طرح کی فضا آفرینی کی جاتی ہے، وہ یقیناً انوکھی اور قابلِ تحسین ہوتی ہے۔ان کے افسانے عام فہم اور سہل زبان میں بیان ہونے کے باوجود اپنی ممتاز اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔

مہر افروزؔ اپنے افسانہ ''کٹی پتنگ'' میں تمثیلی انداز سے دخترانِ مشرق سے مکالمہ کرتی ہیں کہ مغرب کی نقل میں از حد آزادی کی خواہش انھیں گندے نالے میں خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گی۔لہٰذا، آزادی کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہوا کے دوش پر اُڑنے کی آرزو میں اپنی زمین کی کھردری سچائیوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔

مہر افروزؔ کے افسانوں میں

★ کچا گوشت ★ ادھوری عورت ★ دہشت گرد۔ ★ ٹوٹتی سرحدیں ★ پل صراط
★ پھالگنی ★ کٹی پتنگ۔ وغیرہ انتہائی معرکہ آراء افسانے کا درجہ رکھتے ہیں۔

مہر افروزؔ کے افسانے ہماری افسانہ نگاری کی روایت سے پوری طرح مربوط ہیں۔ان میں پلاٹ، واقعات، جزیات نگاری کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کے رموز و اوقاف کی پاس داری ملتی ہے۔افسانے کے فن اور شعریات سے ان کی کما حقہ واقفیت نے ان کے افسانوں میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ان کے افسانے عموماً مختصر ہوتے ہیں تاہم کردار مرکوز افسانے طویل بھی ہیں جن میں تہذیبی عناصر کے بیان سے کردار کی نامیاتی اور فطری بالیدگی کو بروئے کار لانے کی قابلِ تعریف شعوری کاوشیں کی گئی ہیں۔

مہر افروزؔ کے افسانوں کی قرات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے شعور سے ایسے افسانے تخلیق کر رہی ہیں جن میں ماضی کی یادیں بھی ہیں اور مستقبل کے خواب بھی جو آئندہ نسلوں کی زندگی میں تموج اور رنگ بھرنے کے علاوہ ان کی شناخت کا باعث بھی بنیں گے۔

مہر افروزؔ سے مستقبل میں بہترین افسانے کے توقعات وابستہ ہیں۔

پرویز شہریار نئی دہلی

Ashrafi Prints HUBLI. Cell: 9686127862